اِس شمارے میں شامل مضامین، تنقیدی رائے یا شعری وفکری خیال سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارے کی چوبیسویں پیش کش

سہ ماہی

فروغِ مرثیہ

کینیڈا

مئی ۲۰۲۳ء بمطابق شوال المکرم ۱۴۴۴ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

جملہ حقوق بحقِ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل محفوظ ہیں

عنوان	:	فروغِ مرثیہ (بارھواں شمارہ)
اشاعت	:	مئی ۲۰۲۳ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
ایڈیٹر	:	اصغر مہدی اشعر
ناشر	:	فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا
طابع	:	RB پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
قیمت فی شمارہ	:	۱۵/ڈالر، ۱۰/پونڈ، ۲۵۰ روپیہ
ای میل	:	faroghemarsiya@gmail.com
فون	:	+1-905-462-9211
پتہ	:	441 JELINIK TERRACE, MILTON ONTARIO, CANADA L9T7N2

فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

ترتیب

۱۔اداریہ ---------- اصغر مہدی اشعر (کینیڈا) ---------- ۴

۲۔امامِ عصرؑ ---------- ضامنؔ جعفری (کینیڈا) ---------- ۶

۳۔سلام ---------- آصفؔ اختر زیدی (کینیڈا) ---------- ۶

۴۔رثائی ادب اور مقصدیت ---------- عادلؔ مختار (پاکستان) ---------- ۷

۵۔نوتصنیف مرثیہ بعنوان حسن ---------- ڈاکٹر قمرؔ عابدی (انڈیا) ---------- ۱۲

۶۔آلِ رضا کے مرثیہ ''شہادت سے پہلے'' کا تجزیہ ---------- لئیق رضوی (انڈیا) ---------- ۲۳

۷۔گوشۂ نجمیؔ ---------- اشفاق نجمیؔ (انڈیا) ---------- ۳۴

۸۔جموں و کشمیر میں رثائی شاعری ---------- نثار احمد (انڈیا) ---------- ۴۶

۹۔امامِ عصرؑ ---------- شہابؔ کاظمی (امریکہ) ---------- ۵۲

۱۰۔تعارف و مسدس میکش غازی پوری ---------- میکشؔ غازی پوری (انڈیا) ---------- ۵۳

۱۱۔پنجاب کی خواتین مرثیہ نگار ---------- ڈاکٹر ریحان حسن (انڈیا) ---------- ۵۷

۱۲۔غیر مطبوعہ مرثیہ۔ ماتم ---------- ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی (پاکستان) ---------- ۶۰

۱۳۔میر انیسؔ ---------- ڈاکٹر جاویدؔ منظر (پاکستان) ---------- ۶۸

۱۴۔امام علی نقی علیہ السلام ---------- ڈاکٹر ناشرؔ نقوی (انڈیا) ---------- ۶۹

۱۵۔مرثیۂ دبیرؔ میں سراپا نگاری ---------- محمد علی ظاہرؔ (پاکستان) ---------- ۷۰

۱۶۔سلام ---------- شاہدہؔ حسن (کینیڈا) ---------- ۷۸

۱۷۔سلام ---------- قیصرؔ عباس قیصر (پاکستان) ---------- ۷۹

۱۸۔مدح۔ سیّدالنساالعالمین ---------- پروینؔ حیدر (پاکستان) ---------- ۸۰

اداریہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فروغِ مرثیہ کا بارہواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اِس شمارے کے ساتھ اشاعت کے تین سال مکمل ہوئے۔خداوندِ کریم اس ہمت و استقامت کو قائم رکھے اور فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل کے ان منصوبوں کو جاری و ساری رکھے۔ بارہویں شمارے میں آپ کی خدمت میں ہندوستان، پاکستان، امریکہ اور کینیڈا سے رثا کے خزانے مہیا کیے جا رہے ہیں جن میں چھ سلام، تین مسدس، دو مرثیے اور پانچ مضامین کے علاوہ سوزخوانی سے شغف رکھنے والے خواتین وحضرات کے لیے گوشۂ اشفاق نجمیؔ بھی موجود ہے۔تیرھویں شمارے کے لیے مضامین اور کلام کی آمد جاری ہے اور آپ faroghemarsiya@gmail.com پر اپنا کلام یا مضمون بھیج سکتے ہیں۔

آج میں جب یہ اداریہ لکھنے بیٹھا ہوں تو یہاں کینیڈا میں ۱۸ رویں رمضان کی صبح ہے۔کل رات جناب سیّد جاوید حسن صاحب (جو کہ اپنی دختر کے یہاں پاکستان سے ملٹن کینیڈا تشریف لائے ہوئے ہیں) سے مرثیہ تحت اللفظ سننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مجلس جناب مرتضٰی حسین تیورؔ کے یہاں بریمپٹن میں منعقد ہوئی جس میں بانیِ مجلس اور حقیر کی فرمائش پر جناب جاوید حسن نے میر انیسؔ کا معرکہ آرا مرثیہ ''آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی'' پیش کیا۔پچھلے دنوں جناب کرار حیدر جون پوری کے فرزند مرثیہ نگار جناب یداللہ حیدرؔ سے بھی شرفِ ملاقات رہا جو اپنی دختر کے یہاں ملٹن کینیڈا میں ہی مقیم ہیں، بلا شبہ کینیڈا بالخصوص ملٹن مرثیے کے گہوارے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

کینیڈا میں فروغِ مرثیہ کا سفر جاری ہے اور اس سلسلے میں ایک نشست ایسی بھی ہے جس کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے۔خادم کی مرثیے کے سلسلے میں کاوشیں جاری ہیں اور مرثیہ پڑھنے یا مرثیے سے نسبت کسی کام کو ٹالنے کی عادت ناچیز میں نہیں۔دو ہفتے پہلے حسینیہؑ امام بارگاہ پاس مور کے منتظمِ اعلیٰ جناب ظفر حیدر خاں کا فون آیا کہ ہمارا اردو مرثیہ فہمی کے نام سے ایک گروپ ہے جس میں ہم ہر ہفتے مرثیہ منتخب کرتے ہیں اور اس کے بند پڑھتے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ تشریف لائیں اور ہماری رہنمائی فرمائیں، چونکہ سیّد جاوید حسن صاحب بھی یہاں موجود تھے لہٰذا ہم نے حامی بھری اور جاوید صاحب کو ساتھ میں لانے کا وعدہ بھی کیا۔ پاس مور اسکاربرو کا علاقہ ہے جو ہمارے گھر سے گھنٹہ بھر کی مسافت پر واقع ہے۔سچ پوچھیے کہ حسینیہؑ پہنچ کر فروغِ مرثیہ کی اصل صورت دیکھنے کو ملی جہاں یونس عباس صاحب اور ظفر صاحب کی نیابت میں تقریباً ۳۰۔۳۵، افراد جن میں صغیر وکبیر ہر عمر کے طالبِ علم مرثیہ سیکھنے کی خاطر ہمہ تن گوش تھے۔یہاں مرثیہ پڑھنے کے علاوہ مرثیہ سمجھنے کی خاطر بھی دل چسپی تھی اور ہر طالبِ علم نے میر انیسؔ کے مرثیے ''جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہؑ کا'' کا ایک ایک بند پڑھا اور جاوید حسن صاحب اور ہم سے اس سے منسلک سوالات پوچھے، جاوید حسن اور خادم نے واپسی کے سفر میں ان طالب علموں، یونس اور ظفر صاحب کو دعائیں دیں اور بقول جاوید صاحب، ایسی نشست کراچی میں بھی سجانے کا اتفاق نہیں ہوا جہاں خورد و بزرگ اس انہاک سے مرثیہ سیکھنے کی

جستجو میں ہیں۔ اب تک اس سلسلے کی دو نشست ہو چکی ہیں جس میں ہم ان طالبِ علموں کی دل جمعی کے لیے پیش ہو چکے ہیں، ان شا اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آج کل ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی چوتھی جلد کی ایڈیٹنگ میں مصروف ہوں اور ''فرہنگِ مونسؔ'' پر بھی کام جاری ہے۔ ''مونسؔ کے مرثیے'' کی پہلی جلد تقریباً مکمل ہے مگر تینوں جلدوں کو ساتھ لانے کی تیاری ہے، صغیرؔ سونوی کے مرثیے پروف کے دور سے گذر رہے ہیں اور رمضان کے اختتام پر محرم ۱۴۴۵ھ کے لیے مرثیوں کی ریکارڈنگ میں مصروفیت رہے گی۔ اپنے خطوط اور آرا سے نوازتے رہیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

طالبِ دعا
اصغر مہدی اشعر
۹/ اپریل، ۲۰۲۳ء
ملٹن، کینیڈا

منقبت بسلسلہ جشن ولادت امام عصر علیہ السلام

ضامنؔ جعفری

معجز نمائے قدرتِ ربِّ جلیل ہے
''تو عیب میں وجودِ خدا کی دلیل ہے''

دنیا و عاقبت میں نہ کیوں مطمئن ہوں میں
دونوں جگہ وہی میرا نعم الوکیل ہے

اے ختمِ خانوادہِ محبوبِ کردگار
تو میرا ختمِ سلسلہِ سلسبیل ہے

اِتمامِ حجّت اِس لیے کہتے ہیں اہلِ حق
چشمِ خرد کے سامنے حق کا کفیل ہے

ہم عاشقانِ آلِ نبیؐ شرمسار ہیں
جتنی بھی آپ سے ہو مودت قلیل ہے

مانا خیالِ خام زیارت ہے آپ کی
پھر بھی خیال، خیال کتنا حسین و جمیل ہے

رونق فروزِ دہر ہو، ضامنؔ کی ہے دعا
تو آخری ہدایتِ حق کی سبیل ہے

سلام

آصفؔ اختر زیدی

صدا بلند ہے چاروں طرف۔ خدا مددے
مرے دُروں کی آواز مرتضیٰؑ مددے

مرے سفر کا تتمّہِ نظر نہیں آتا
دیارِ شام مدد، دشتِ نینوا مددے

مری جبیں کو تلاشِ مقامِ سجدہ ہے
امیرِ قافلۂ غم کے نقشِ پا مددے

وہ حبس ہے کہ مِری سانس رُکنے والی ہے
ہوائے ساحلِ دریائے علقمہ مددے

یقین ظلمتِ ابہام سے نبرد میں ہے
طلوعِ مہرِ درخشانِ کربلا مددے

مقصرین کی پیشانیاں بھی بولیں گی
اب اُن سے کہہ۔ کہ پکاریں، عبا، قبا مددے

مَیں اپنی نسل کو زنجیر زَن بَنا پاؤں
لبِ بتولؑ سے نکلی ہوئی دعا مددے

درِ نجف پہ مَیں خاموشیوں میں ہوں آصفؔ
مِرا وجود ہے۔ سر تا قدم صدا مددے

رثائی ادب اور مقصدیت

عادلؔ مختار

رثائی ادب اور مقصدیت شعر اور دیگر اصنافِ سخن میں ایک خاص مزاج کا فرق ہے اور اس مزاج کی تشریح پر ایک طرف تنقیدِ نظری کی عمارت کھڑی ہے تو دوسری طرف اسی مزاج کی معرفت سے خود شاعری کا اعتبار قائم ہے۔ کہا گیا ہے کہ شعر کا سفر ایک لکیر کا سفر نہیں بلکہ ایک منحنی حرکت کا نام ہے۔ یہاں پر شعر سے مراد فقط ایک شعر نہیں بلکہ ایک شعر سے ایک مکمل نظم اور ایک نظم سے مجموعی طور پر تمام کی تمام شاعری مراد ہے۔ شعر کے منحنی ہونے سے مراد ہے کہ شعر اور فطرت یا شعر اور حقیقت کا تعلق دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم کے جیسا نہیں بلکہ یہ ایک قوس کے جیسا تعلق ہے یعنی شعر ایک حقیقت تک ممکنہ زاویوں کو طے کرتا ہوا سفر ہے۔ شعر کے مذکورہ مزاج کی تشریح ڈاکٹر وزیر آغا یوں فرماتے ہیں کہ شعر کے قوس ہونے سے مراد ہے اس کا اپنی طرف لوٹنا۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی تشریح بھی قبول کی جائے تو معاملہ پہلی تشریح سے مختلف نہ ہوگا وہ یوں کے اگر شعر قوس ہونے کے اعتبار سے اپنی طرف لوٹتا ہے تو بذاتِ خود شعر کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں جو بنیادی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شعر شعور سے مشتق ہے۔ شعور یعنی کیا؟ شعور یعنی کسی حقیقت کے ادراک پر مبنی حرکت۔ لہٰذا شعر کے مزاج کی کسی بھی توضیح میں اس کا حقیقت کے ساتھ ربط لازم ہے کہ کیسی بھی توضیح کیوں نہ ہو شعر فطرت یا حقیقت کو کعبہ بنا کر اس کے گرد طواف میں مصروف دکھائی دے گا۔ فطرت یا حقیقت شعر کا قبلہ ہے تو اس بات کے ردّ و قبول میں کہیں اور تو بحث ہو سکتی ہے مگر کربلا کے باب میں یا حضراتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ذکر میں تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں بنتی کیونکہ یہ انوارِ مقدّسہ بذاتِ خود ٹھوس حقائق ہیں لہٰذا اس باب میں شعر اور حقائق کا تعلق مزید مضبوط دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات بھی اس باب میں نہایت اہم ہے کہ اصنافِ سخن میں نثرِ کربلا کے حوالے سے، سب سے زیادہ خدمت بھی شعر ہی کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کربلا کے رثائی ادب کی مقبولیت ہر دور میں تاریخ سے کہیں زیادہ رہی ہے۔ کائناتِ آدم عالم میں سیّدا لشہداءؑ کی ذات وہ ہے کہ جس پر سب سے زیادہ اشعار کہے گئے۔ اگر کربلا پوری دنیا میں شعر و سخن کی سب سے بڑی ''سٹیک ہولڈر'' ہے تو ایسا ممکن نہیں کہ کربلا کے باب میں شعر فطرت، حقیقت یا کربلا کی بنیاد میں موجود اصولِ عقائد یا اس معرکۂ حق و باطل سے متشرح ہوتے ہوئے نظریات سے بیگانہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو کم سے کم کربلا کی ''ڈومین'' میں ایسی شاعری نہ صرف اعتبار کھو دے گی بلکہ لایعنی ہو کے رہ جائے گی۔ کوئی بھی شعر جو سیّدا لشہداءؑ یا خانوادۂ رسالتؐ کے کسی بھی فرد سے متعلق ہو اور وہ ان حضرات کے عقائد یا موقّف کے خلاف واقع ہو تو ایسا شعر شاعری نہیں بلکہ ''بے ہودہ نعرہ'' یا وزن میں کہی گئی ''لہو الحدیث'' سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ اور اس بات کے منکشف ہونے کے لیے اور اس دعوے کو ثابت ہونے کے لیے حقیقتِ شعر کے بعد ان ذواتِ مقدّسہ، جو رثائی اور عزائی شاعری کے ارکان ہیں، کا مقدماتی عرفان بھی ضروری ہے۔ خدا نے جو کچھ بھی پیدا کیا حق کے ساتھ پیدا کیا یعنی اس کی پیدا کی ہوئی کوئی بھی شے بے مقصد، اس کی کہی ہوئی کوئی بھی بات لایعنی اور اس کا کوئی بھی فعل خالی از حکمت نہیں۔ جب ایک مچھر جیسی معمولی مخلوق بھی ایک حکمت اور مقصد رکھتی ہے

تو ان اوّلینِ خلائق انوار کی مقصدیت اور حق کی کیا انتہا ہوگی کہ جن کے فعل کو وہ اپنا فعل اور جن کے کلام کو وہ اپنا کلام کہتا ہے۔ سیرت کی صحیح ترین روایات کو اکٹھا کریں اور ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں ایک بھی کام بلا مقصد نہیں کیا اور ایک بھی کلمہ بے معنی نہیں کہا۔ بعثت سے قبل اور بعثت کے بعد وہ یکساں طور پر متحرک رہے اور جانفشانی سے معاشرے میں مقصدیت کی تبلیغ اور ترویج کرتے رہے اور بالآخر وہ ایک ایسی ثقافت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گئے کہ جس میں جوتا پہننے اور بیت الخلاء میں داخلہ کے خاص طریقہ سے لے کر آدابِ حرب تک تمام چھوٹے بڑے امور میں مقصدیت کارفرما نظر آنے لگی۔ تیئس برس کے اندر اندر اس سطح کا انقلابِ فکر و نظر ایک ایسا واقعہ ہے جو بلا شبہ بے نظیر ہے۔ تیئس برس پہلے جو لوگ لایعنی باتوں اور بے مقصد چیزوں پر قبیلے کے قبیلے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے تیئس برس بعد بازار میں خاص آداب کے ساتھ گزرنے میں بھی ان کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد نظر آیا۔ مقصدیت کی یہی ثقافت حضرتِ فاطمہ زہراؑ کی مختصر مگر پاکیزہ ترین زندگی میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی بھر کی تقریر یا تو تسبیحِ خدا پر مشتمل الفاظ سے معمور ہے یا خلق کے مسائل کے حل پر مبنی کلمات ہیں جو بالآخر منشاء ایزدی قرار پانے پر دوبارہ تسبیحِ قدُّوس کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح علیؑ اور بعدِ علیؑ تمام ائمۂ ہدایت علیہم السلام کی سیرت یہی رہی کہ جن کی زندگی میں کوئی ایک بھی کلمہ اور کوئی ایک بھی فعل خالی از معنی و مقصد اور بے فائدہ نظر نہیں آتا۔ جب سیرت کے مطالعے اور اس کی بنیاد پر کیا گیا تجزیہ ہمیں مذکورہ بالا نتیجہ فراہم کرتا ہے تو یہ انقلاب کس قدر افسوسناک اور قابلِ مذمت ہے کہ اہلبیتؑ جیسے پاکیزہ اور عظیم نفوس کی مدح اور ان کے ذکر کے نام پر انتہائی بے مقصد اور لایعنی شاعری کی جائے اور اس سے بڑھ کر حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس قسم کی شاعری آج تیزی سے رواج پا رہی ہے بلکہ ہماری عزائی ثقافت میں خاص حد تک اثر و رسوخ بھی حاصل کر چکی ہے اور اس کام کو انجام دینے والوں کی مذمت کی بجائے حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ عزائی ثقافت میں پھیلنے والی یہ لایعنیت یقیناً مکتب کا سراسر نقصان ہے۔ جب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم، حضرت زہراؑ اور امیر المؤمنینؑ جیسے بلند ہمت اور با مقصد تحرُّک رکھنے والے نفوس کی مدح میں کہے جانے والے اشعار بے مقصد اور بے معنی ہوں گے تو یہ ان سے الفت کی بجائے دوری کا سبب بنیں گے اور یہ چیز ان نفوس کے کردار کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ اہلبیتؑ، اہلِ حق ہیں یعنی اہلِ ہدف و مقصد ہیں اگر ان کے تعارف میں ان کے ہدف اور مشن کو نہ شامل کیا جائے تو ان کے فضائل پر دلائل کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی اور یہ یقیناً ان کے حق کی تقصیر ہوگی۔ اہلبیتؑ کے فضائل کا ذکر بذاتِ خود ایک مقصد ہے اور اس مقصد کا نتیجہ یہی ہے کہ ان کے فضائل کا عرفان انسان کی انسانیت کی تکمیل کرے۔ نفوسِ مقدسہ کے تمام تر کمالات، معجزات اور کرامات کا ذکر آدمیت کے رُخ کو نکھارتا ہے اور خود انسان کی عظمت کا سبب بنتا ہے اور انسان کی فکر کو وہ اوج بخشتا ہے کہ انسان ان ارکانِ توحید کی معرفت کے طفیل ذاتِ واجب کے قرب کا حقدار قرار پاتا ہے۔ ان ارواحِ علیّینؑ کا ذکر خود انسانوں کو اعلیٰ بنا دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا ذکر ذاتِ واجب کی عبادت ہے۔ اہلبیتؑ کے فضائل اور کمالات کے ذکر سے ایک اور نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کی معرفت کے بعد انسان عالمِ انسانیت کا پہلے سے کہیں زیادہ خیر خواہ اور خیر اندیش بن جاتا ہے اور معاشرے کے لیے اصلاح، افادہ اور رفاہ کے حوالے سے سرگرم ہو جاتا ہے۔ دیگر انسانوں کے دکھ درد کو اپنے دکھ درد سے بڑھ کر محسوس کرتا ہے اور سماج میں جہاں بھی ظلم دیکھتا ہے تو اس سے نفرت کو عام کرتا ہے اور ستم کے راستوں کو مقدور بھر مسدود کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر کے مظلومین کا مدافع بن کر ابھرتا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب جنابِ امیرؑ کا تعارف مصلحِ وضعِ انسانی مولائے موحّدین، امامِ عادل، یتیموں

اور بے سہاروں کے ملجا و ماوٰی اور اس طرح کے دیگر اوصافِ حمیدہ کے ذریعے کروایا گیا ہو یعنی مختصراً یہ کہ مدحِ علیؑ میں مقاصدِ علیؑ کو فراموش نہ کیا گیا ہو۔ مدحِ اہلبیتؑ کے نام پر یاوہ گوئی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج وہ تمام چیزیں جو اہلبیتؑ کو مرغوب اور محبوب تھیں بعض شعراء انھیں چیزوں سے عوام کو متنفّر کرنے میں مصروف ہیں۔ اس قسم کے ''شعرائے اہلبیت'' آج فکری طور پر اہلبیتؑ کے مقابل کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہ نماز، حج، زہد، مصلّی اور تقوی جو اہلبیت علیہم السلام کو محبوب تھے آج ''شعرائے اہلبیتؑ'' ان چیزوں کو اعدائے اہلبیتؑ کا حصہ قرار دے کر ان کی تضحیک میں مصروف ہیں۔ اگر ہم ان رجحانات کے بڑھنے کے اسباب معلوم کریں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے اس قسم کے اشعار اور کلام لکھنے والے تمام شاعر مسلمات دینی کے شعور سے تو نابلد ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مزاج ادب تاریخ شعر اور دائرہ کار شعری سے بھی ناواقف ہیں۔ ایسے بہت سے شاعر کہ جنھیں مبادیاتِ مذہب اور مقدمات شاعری تک سے واقفیت نہیں وہ بے نتیجہ لا حاصل اور اہلِ بیت علیہم السلام کے نام پر خود اہلِ بیت علیہم السلام کے عقائد اور تبلیغات کے منافی کلام کی تخلیق اور ترویج میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے شعراء نے شعر کو اس کے اپنے دائرے سے نکال کر مذہبی جدلیات کے دائرے میں پھینک دیا ہے۔ حالانکہ شاعری علم کلام ہو یا فنِ مناظرہ کے حساب سے پرکھنے کی چیز ہی نہیں۔ مثال کے طور پر جب رثائی اور عزائی حلقے میں ایسے اشعار کی گونج ہو کہ جس میں امیر المؤمنین علیہ السلام کو جناب آدم علیہ السلام کا بنانے والا اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو مٹی سے جناب حوّا کی تخلیق کرنے والی ہستی بتایا جائے یا کبھی جناب زینب سلام اللہ علیہا کو یہ کہتے ہوئے سنایا جائے کہ جب میں بولوں تو قرآن لب نہ کھولے اور اس طرح کے دیگر اشعار کہ جن میں حفظ مراتب کو پامال کیا گیا ہوں اور دینی مسلمات کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش اور اپنے تصور کی بنیاد پر کوئی غیر از حقیقت خیال نظم کیا گیا ہوں تو ایسے میں وہ اشعار شعری دائرہ کار سے نکل کر مذہبی جدلیات اور اور دیگر مذہبی فنون میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایسا ہونا بذاتِ خود ادب کے مزاج کے خلاف ہے۔ بعض شعراء اعمال اور عبادات میں تقابل اور تصادم میں مصروف ہیں مثلاً نماز افضل ہے یا ماتم حج افضل ہے یا زیارت مصلا افضل ہے یا فرشِ عزا اور اس طرح کے دیگر جہل پر مبنی مضامین کہ جو سراسر تقصیرِ واجبات پر مبنی ہیں اور جن کا کوئی مثبت اور تعمیری نتیجہ نہیں ہے۔ اس قسم کی باتیں رثائی ادب میں پنپنے کی نہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے شعر کہا جائے اور اس کے بعد اس کی رد میں یا اس کے حق میں آیات اور روایات کے مابین ٹکراؤ کی فضا قائم ہو جائے۔ یہ بات کسی بھی طور شاعری کے حق میں نہیں اور جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہ مذہبی مسلمات سے تو ٹکرا ہی رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ علم و ادب اور خصوصاً فنِ شعر کے حوالے سے نہ صرف کوئی خدمت انجام نہیں دے رہے بلکہ وہ ایسی چیزیں تخلیق کر رہے ہیں جو اس فن کے لیے انتہائی نامناسب واقع ہو رہی ہیں کہ جس سے آج شاعری تفسیر، حدیث اور فقہی اصول کے سامنے شرمندہ دکھائی دے رہی ہے۔ میری نظر میں مذکورہ رجحان اس لیے بڑھ رہا ہے کہ آج سامعین ہوں یا خود شعرا ان میں مذہبی شعور ہو یا شعری دونوں کا فقدان پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کو خدا کی صفات کے مظاہر ہونے کو خدا کی صفات میں شریک ہونا سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی لیے حضراتِ معصومین علیہ السلام کو خالق رازق تک کہہ دیا جاتا ہے جو کہ قرآن اور احادیث کی رُو سے ان کی حقیقتِ عبودیت کے یکسر منافی ہے۔ اس قبیل کے جتنے بھی اشعار ہیں وہ آیات اور روایات اور سیرت معصومین علیہم السلام سے روبرو ہونے پر خاک ہو جاتے ہیں اور پھر فنِ شعر کے دائرے سے بھی نکل سوائے نعروں اور شور کے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے شاعروں اور اشعار کی بیسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ کسی بھی فن کے معیارات کو جاننے کے لیے اس فن کے ماہروں اور ان کے کارہائے

نمایاں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اگر شاعری کے معیارات اور خصوصاً رثائی اور شاعری کے معیارات جاننا ہوں تو یقیناً ہمیں میر انیسؔ مرزا دبیرؔ نسیمؔ امروہوی جوشؔ ملیح آبادی اور علامہ جمیلؔ مظہری ایسے رثائی ادب کے مجتہدین کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی شاعری تو ہرگز ایسی نہیں کہ جس کی دلیل کے لیے یہ جس کے حسن و قبح کے ثبوت کے لیے ہمیں ان کی شاعری کو مذہبی فنون کے مطابق پر رکھنا پڑے یا ان کے نظم کیے گئے خیالات کے حوالے سے کوئی فتویٰ لینا پڑے گا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے شاعری یا رثائی ایسی ہونا چاہیے کہ جس کی قبولیت کے لیے یا رد کے لیے کسی فتوے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ مگر ایسا دیکھنے میں آرہا ہے اور صورتحال مزید بگڑتی جارہی ہے کہ بہت سے شعراء ایسے ہیں کہ جو نہ صرف اپنے اشعار میں فتوے صادر کررہے ہیں بلکہ ان کے اشعار پر مختلف مذہبی طبقوں سے بھی فتوے صادر ہورہے ہیں۔ اور یہ یقیناً اپنے دائرۂ کار سے شعراء کی ناواقفیت کی بنیاد پر ہے۔ مدحت کے نام پر کس طرح حفظِ مراتب کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ جہلِ مرکّب کے زور پر پامال کرنا بھی چند معروف شعراء کی طرف سے دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اہلبیت علیہم السلام کے فضائل کی کوئی حد نہیں شاید اس مطلب یہ نکالا گیا ہے قرآن اور سیرتِ معصومینؑ کی حدود کی بھی رعایت کیے بغیر توسنِ قلم کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ کربلا جو حفظِ مراتب کی امین ہے کیا اس کی فضا میں ایسے اشعار کوئی معنی رکھ سکتے ہیں جو اس معیار پر پورا نہیں اترتے؟ مثلاً ایک صاحب کا یہ کہنا کہ جو مقام امام حُسین علیہ السلام کے گھوڑے کا ہے وہ تو آدمؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک کسی نبیؑ کا نہیں۔ اس طرح کا کلام تو کسی قوّال کی جراٗت نہیں کہ گا سکے چہ جائیکہ رثائی فضا میں اس کی گونج ہو۔ اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ''شعرائے اہلبیتؑ'' نے توحید اور تمام کے تمام واجبات اور شعائرِ دینی اہلبیتؑ کے مخالفین کے نام کردیئے ہیں اور اہلبیتؑ کے پاس لے دے کے مست ملنگ بے مقصد بے ہدف اور منحرف قسم کے لوگ ہی رہ گئے ہیں۔ جبکہ انبیاءؑ اور ائمّہ علیہم السلام کی زندگی کا مشن ہی یہی رہا ہے کہ لوگوں کو معرفتِ مقصد کروائی جائے تاکہ کمالِ انسانی کا ہدف مکمل ہو مگر آج انقلابِ زمانہ دیکھیے کہ آئمّہؑ کے نام لیوا انھیں کے مقصد کو انھیں کا نام لے کر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح کا کلام فکری طور پر تو پست ہے ہی ساتھ ساتھ ادبیت سے بھی محروم ہے کہ ادب تو ایسا ملکہ ہیں کہ جس سے وابستہ ہوا سے ہر ناشائستہ بات سے بچاتا ہے۔ علامہ ابنِ منظور افریقی نے علم و ادب کی وجہِ تسمیہ کے متعلق لکھا ''ادب کے معنی اصل میں بلانے اور دعوت دینے کے ہیں ادب کو ادب اس لیے بھی کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو بہتر اوصاف و اخلاق کی دعوت دیتا ہے'' اب اگر دقّت سے نظر کی کی جائے تو اس قسم کی شاعری سے نہ صرف مجلسی حلقہ کا نقصان ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تو یہ ادب کی فضا کو مکدّر کیا جارہا ہے۔ اگر معاملہ اسی طرح رہا تو مرثیے ایسی ادب کی نمائندہ صنف کی ناقابلِ تلافی حد تک تقصیر ہوتی رہے گی۔ آج مجلس کی عمومی فضا میں ایک صحت مند فکر رکھنے والے رثائی شاعر کا سانس لینا بھی مشکل ہورہا ہے کہ منظر پر حقیقتِ شعر اور عرفانِ عزا اور ثناء سے ناآشنا لوگوں کی آوازوں کو ہی مضبوط کیا جارہا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حقیقی رثاء اور ثنا پر مبنی شاہکاروں کی بھرپور اشاعت کی جائے اور حقیقی ادب کی تبلیغ رضاکارانہ طور پر کی جائے۔ اس کے ساتھ معروف ہونے کے لازمے کی جگہ مضبوط ذہنوں کی حوصلہ افزائی کی تقریب کی جائے۔ اس کے علاوہ وہ نوجوان جو رثائی ادب میں ایک وژن کے ساتھ وارد ہوئے ہیں انھیں سب سے پہلے خود کو رضاکار سمجھنا ہوگا اور سب سے بڑھ کر مشکل راستوں پر گامزن ہونا ہوگا۔ ایسا کیا کہہ دیں کہ بازی جیت جائیں اس فسوں سے نکلنا ہوگا۔ اس مقام پر نہایت مناسب معلوم ہورہا ہے کہ ڈاکٹر جانسن کی شاعر اور اس کے قاری کے حوالے سے کی گئی گفتگو سے شمس الرحمن فاروقی صاحب کے ترجمہ کے ساتھ اقتباس پیش کروں کہ جس سے واضح طور پر ہر عہد کے

شاعر کے لیے اس کے منصب کی حقیقت واضح ہوتی معلوم ہوتی ہے۔''شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو اپنے عہد اور اپنے ملک کے تعصّبات سے آزاد رکھے۔اس کا فرض ہے کہ حق و باطل پر ان کی تجریدی اور غیر متبدل (Invariable) حیثیتوں میں غور وفکر کرے۔اسے اپنے ہم عصر قوانین وآرا کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عمومی اور ماورائی حقائق کی بلندیوں تک پہنچنا چاہیے وہ عمومی اور ماورائی حقائق جو ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں کبھی بدلتے نہیں۔اس لیے شاعر کو اپنی شہرت کی سست رفتاری (یعنی شہرت میں کمی) پر قانع ہونا چاہیے، اپنے عہد کی تعریف و ستائش کو حقارت سے دیکھنا چاہیے (یعنی اس کا متمنی نہ ہونا چاہیے) اور اپنے مطالبات کو آئندہ نسلوں کے انصاف کے حوالے کر دینا چاہیے۔(ڈاکٹر جانسن ۱۷۸۱)''

دبیرؔ کے مرثیے

جلد چہارم

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین: اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مرثیہ

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

مونسؔ کے مرثیے

جلد اوّل تا سوئم

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین: اصغر مہدی اشعر

نوتصنیف مرثیہ بعنوان حُسن

(ڈاکٹر سیّد قمرؔ عابدی)

حسنِ توفیق مرا حسن پہ اٹھا ہے قلم — محورِ حسن اے اللہ مرا رکھ لے بھرم
فکر پر پھر سے مری ہو جو ترا حسنِ کرم (۱) میں بھی کچھ حسن کی تعریف کروں آج رقم
ہو اگر تیری عطا تیرے اثر سے کھولوں
حسن کے باب کو میں حسنِ نظر سے کھولوں

مرکزِ علم سے کچھ علم کی پائی دولت — کچھ خیالات میں پرواز کی آئی قوت
کچھ طبیعت نے بھی تبدیل کی اپنی عادت (۲) حسن کے باب میں کچھ لکھنے کی تب کی ہمت
نورِ عصمت کے وسیلے سے تسلسل پہنچا
وادیٔ حسن میں شاعر کا تخیل پہنچا

جو طہارت کی سند رکھتی ہے وہ مے پی ہے — مدتوں مدحتِ گلدستۂ عصمت کی ہے
فکر نے نورِ ہدایت سے ہدایت لی ہے (۳) تب تخیل نے درِ حسن پہ دستک دی ہے
پھر بھی ہوں خوف زدہ چوٹ نہ کھا جاؤں کہیں
میں بھی موسیٰؑ کی طرح غش میں نہ آ جاؤں کہیں

مرکزِ حسن زمانے میں ہے اللہ کی ذات — اُس سے ہی حسن کے ظاہر ہوئے اسرار و نکات
حسن کو اُس کے ہی جوہر سے میسر ہے حیات (۴) اُس پہ ہی زیب بھی دیتی ہے فقط حسن کی بات
ذکر اُس کا جو چھڑا ، حسن کی بھی بات چلی
لطف اُس کا جو ہوا ، حسن کی بارات چلی

حسن اس کے ہی سبب صاحبِ اعزاز ہوا — اس سے ہی ہوش ربا حسن کا انداز ہوا
حق کا یہ اس کی عنایات سے دم ساز ہوا (۵) ذاتِ معبود سے ہی حسن کا آغاز ہوا
اپنی تخلیق سے بتلایا ہے کہ حسن ہوں میں
خود یہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حسن ہوں میں

کب یہ انساں میں سکت ہے ترا دیدار کرے اپنی آنکھوں کو ترے حسن سے دوچار کرے
پرتوِ حسنِ الٰہی سے شرربار کرے (۶) قلب کو نورِ حقیقی کا طلب گار کرے
طور کا خاک میں تبدیل علاقہ دیکھے
کون موسیٰؑ کی طرح حسن کا جلوہ دیکھے

منبعِ حسن وہی ، حسن کا محور بھی وہی حسنِ کامل بھی وہی ، حسن کا جوہر بھی وہی
کشتیٔ حسن بھی وہ ، حسن کا لنگر بھی وہی (۷) حسن کے ذیل ہر اک شے کو میسر بھی وہی
حسن کا راز وہ دانا ہی سمجھ پاتا ہے
حسن کی تہ میں جو حکمت سے اتر جاتا ہے

حسن پت جھڑ بھی ہے ، گلشن میں بہار آنا بھی داغ سینے پہ گلِ لالہ کے بن جانا بھی
چڑھتی بیلوں کی وہ انگڑائی وہ بل کھانا بھی (۸) چشمِ نرگس کا چمن زار میں اترانا بھی
حسن ہے اپنی نزاکت کا بھرم رکھ لینا
پھول کا خار کی سرحد میں قدم رکھ لینا

باغباں یہ گل و بلبل کا فسانہ کیا ہے شوخ کلیوں کا یہ رنگین زمانہ کیا ہے
تتلیوں کے یہاں پھرنے کا بہانہ کیا ہے (۹) یہ پرندوں کا خوش آہنگ ترانہ کیا ہے
ضد میں پھولوں کی ہنسی ، شاخوں کی انگڑائی ہے
حلقۂ حسن میں گلشن کی بھی رعنائی ہے

دیکھ کر صدمۂ گل ، آہ میں کیوں کر نہ بھروں کیوں میں سیماب طبیعت دلِ جاناں سے ڈروں
زندگی تیری اداؤں پہ میں کیوں کر نہ مروں (۱۰) اِن لچکتی ہوئی شاخوں کا بھی کچھ ذکر کروں
مجھ کو حق آشنا ہر ڈھنگ حسیں لگتا ہے
اُس کی خلقت کا ہر اک رنگ حسیں لگتا ہے

موجِ دریا کی روانی کا طریقہ دیکھو جھک کے شاخوں کا یہ معبود کو سجدہ دیکھو
خوش نما پھولوں پہ خوشبو کا یہ پہرہ دیکھو (۱۱) سنگ کو ٹوٹ کے بنتے ہوئے ریزہ دیکھو
ان پہ فطرت کے اصولوں کا اثر کاری ہے
حسنِ رفتار سے یہ حسنِ سفر جاری ہے

دل میں ذرّے کے بھی ذرّوں کی ہے بستی بستی اپنے محور کے ہی اطراف ہے گردش جن کی
جوہری جس کو توانائی خدا نے بخشی (۱۲) جس کے ہلکے سے تغیر سے ہے دنیا ہلتی
اس کے عنصر میں وہ جوہر کہ اُجالا ہو جائے
گر یہ ٹکرائیں تو دنیا تہ و بالا ہو جائے

حسن مضمر ہے تو ہر چیز یہاں دائمی ہے   حسن سے رہ گزرِ علم میں بھی روشنی ہے
آدمی حسن کے سائے میں ہے تب آدمی ہے (۱۳) زندگی میں ہے اگر حسن تو پھر زندگی ہے
زندگی جینے کی پُر کیف ادا سمجھے ہیں
اہلِ حق حسن کو توفیقِ خدا سمجھے ہیں

حسن ارمانوں سے تعمیرِ محبت کا مکاں   حسن نا پختہ ہمکتے ہوئے بچے کی زباں
حسن بارش کی برستی ہوئی بوندوں میں نہاں (۱۴) حسن سجدے کی طرف کھینچتی آوازِ اذاں
حسن کو دیکھ کے دل غنچوں کے کھل جاتے ہیں
حسن سے آ کے گلے خار بھی مل جاتے ہیں

حسن حساس طبیعت کا حَکم رہتا ہے   حسن قرطاسِ مودت پہ رقم رہتا ہے
حسن کا راہِ محبت پہ قدم رہتا ہے (۱۵) حسن چہرے کی بناوٹ میں بھی ضم رہتا ہے
قلبِ مجروح کی دھڑکن کا سبب جانتے ہیں
حسن کو ، حسن کے عشاق خدا مانتے ہیں

دل کی سرکار نے ہر جا اِسے شہرت بخشی   جاں لٹا کر اسے دیوانوں نے عظمت بخشی
کاسہ برداروں نے توفیق کی دولت بخشی (۱۶) حسن کو قیس نگاہی نے سعادت بخشی
دل کی دھڑکن کو رگِ جاں سے بہم جوڑ دیا
حسن کے باب میں رنگت کا بھرم توڑ دیا

حسن اُن میں ہے جو ہیں ذوقِ عبادت والے   نفس کے اپنے امیں ، صدق و صداقت والے
مونسِ خلقِ خدا ، خُلق و مروت والے (۱۷) ہیں حسیں ، پاک نظر ، پاک طبیعت والے
ہو نظر پاک تو منظر بھی ابھر آتا ہے
حسن ہر روپ میں بندے کو نظر آتا ہے

حسن کو اُس کی بلندی سے ہی پرکھا جائے   اِس کو معیارِ طہارت سے ہی جانچا جائے
اِس کو میزانِ محبت پہ ہی تولا جائے (۱۸) حسن کو دل کی نگاہوں سے ہی دیکھا جائے
گر بصیرت ہے تو ہستی میں اُتر آئے گا
حسن موجود ہر اک شے میں نظر آئے گا

حسن مزدوروں کے ماتھے کے پسینے سے عیاں   حسن دہقاں کی ہتھیلی کی لکیروں کے نشاں
حسن اٹھتا ہوا چولہے سے غریبوں کے دھواں (۱۹) حسن بوڑھا نظر آتا کوئی خدار جواں
حسن کھیتوں میں نظر آتی کسانوں کی امید
حسن سرحد پہ جواں ہوتی جوانوں کی امید

حسن ہے دل کو ، تمناؤں کا مقتل کرنا حسن کانٹوں سے بھری راہ کو مخمل کرنا
اپنے اعمال سے خود اپنے کو صندل کرنا (۲۰) اپنے کردار کی تلوار پہ صیقل کرنا
حسن یہ وہ ہے سدا جس کا اثر رہتا ہے
جسم مٹ جاتا ہے کردار مگر رہتا ہے

حسن تہذیب و تمدن کی امانت ٹھہرا حسن تاریخ کے گوشوں کی وضاحت ٹھہرا
حسن خود حسن کے فرزانوں کی زینت ٹھہرا (۲۱) حسن قدروں کی حفاظت کی ضمانت ٹھہرا
اختلافات کی دیوار گرا دیتا ہے
حسن بگڑی ہوئی باتوں کو بنا دیتا ہے

حسن انسان کی فطرت میں نظر آتا ہے فکر میں ، اُس کی ذہانت میں نظر آتا ہے
حسن انسان کی طینت میں نظر آتا ہے (۲۲) داخلی حسن طبیعت میں نظر آتا ہے
ظاہری حسن نے صورت کی ہی صورت دیکھی
داخلی حسن نے انسان کی سیرت دیکھی

پیکرِ جسم کو ہی حسن ہے جس نے جانا صرف تفریح کا سامان ہی جس نے سمجھا
چشمِ شہوت سے ہی بس حسن کو جس نے دیکھا (۲۳) زر کی خاطر سرِ بازار ہے نیلام کیا
حسن کے حسن کی توہین پہ آمادہ ہے
جسم کا وہ ہے پجاری وہ ہوس زادہ ہے

سنگ دل شوخ کی الفت میں جو دل کھوتا ہے جاگتا ہے نہ کبھی چین سے جو سوتا ہے
بے سبب ہنستا ہے بے وقت کبھی روتا ہے (۲۴) حسن محتاجِ صنم اُس کے لیے ہوتا ہے
اُس کو یہ ہوش کہاں حسن کی وسعت کیا ہے
اُس کو معلوم کہاں حسن کی عظمت کیا ہے

شوخیٔ حسن کا سودا ہوا زرداروں میں حسن کا جسم پروسا گیا درباروں میں
حسن کا نام اچھالا گیا تکراروں میں (۲۵) حسن کا نام ہوس پڑ گیا بدکاروں میں
حادثوں کے یہ ہمیشہ سے دہانے پہ رہا
آئینہ حسن کا پتھر کے نشانے پہ رہا

حسن پھولوں کے کٹوروں میں ہے شبنم رکھنا صبر کا ہر دلِ مظلوم پہ مرہم رکھنا
منتشر کرکے بھی ہر چیز منظم رکھنا (۲۶) ابنِ آدم کو ہر اک شے پہ مقدم رکھنا
منحصر اب ہے یہ انساں پہ کہ انسان بنے
چاہے کردار کی پستی سے وہ حیوان بنے

حسن ، اخلاق کی محمل میں سوار ہوتا ہے حسن کے گرد طہارت کا حصار ہوتا ہے
نور کا حسن کی تسبیح میں تار ہوتا ہے (۲۷) حسن کا ذکر عبادت میں شمار ہوتا ہے
فیضِ حق ، حسن سے عابد بھی لیا کرتے ہیں
تذکرہ حسن کا سجدے میں کیا کرتے ہیں

حسن پاکیزہ ساعت میں نظر آتا ہے حسن انساں کی شرافت میں نظر آتا ہے
حسن خالق کی عبادت میں نظر آتا ہے (۲۸) حسن ماں باپ کی خدمت میں نظر آتا ہے
چھوڑ کر اِن کو نہ کچھ اور تلاشا جائے
ان کے قدموں میں ہی فردوس کو ڈھونڈھا جائے

حسن نعماتِ الٰہی کی فراوانی ہے حسن مشکل میں میسر ہوئی آسانی ہے
پیشِ حق اپنے گناہوں پہ پشیمانی ہے (۲۹) حسن خوشنودیٔ رب ، جذبۂ قربانی ہے
راہِ قربانی و ایثار میں گھر رکھ دینا
زیرِ شمشیرِ ستم حسن ہے سر رکھ دینا

حسن کی اصل حقیقت کا جسے دھیان نہیں جادۂ حسن کی جس شخص کو پہچان نہیں
جس کو پاکیزگیٔ حسن کا عرفان نہیں (۳۰) اُس کو کیسے کہیں انسان وہ انسان نہیں
اپنی پاکیزہ نظر سے اُسے دیکھو تو ذرا
حسن شہ رگ کے قریں ہے اُسے ڈھونڈھو تو ذرا

حسن قربانی و ایثار کی ہر منزل میں حسن ہے صبر و تحمل کی سجی محمل میں
مقتلِ عشق میں قربان ، دلِ بسمل میں (۳۱) ذکرِ حیدرؑ سے شربار ہر اک محفل میں
سلسلہ خالقِ برحق سے ملا دیتا ہے
تذکرہ حسن کا چہرے کو کھلا دیتا ہے

حسن تعظیم میں زہراؑ کی اترنا زُہرہ حسن نابینہ صحابی سے بھی خود کا پردہ
حسن بے سایہ محمدؐ پہ کرم کا سایہ (۳۲) حسن عمران کا پیغمبرِ حق سے رشتہ
حسن ہے حق میں بھتیجے کے نکلتے رہنا
رات بھر بچوں سے بستر کو بدلتے رہنا

حسن دو حصوں میں تقسیم جدارِ کعبہ حسن قرآن سمیٹے ہوئے ''بے'' کا نقطہ
حسن معراج کی منزل میں خدا کا لہجہ (۳۳) دیکھنا جس کو عبادت وہ علیؑ کا چہرہ
حسن ہے حاکمِ برحق کا بھی محنت کرنا
بیلچا لیکے نکل آنا مشقت کرنا

حسن ہے چادرِ تطہیر کی عظمت کا حصار حسن خیرات میں بخشی گئی اونٹوں کی قطار
رن میں نسلوں کو پرکھتی ہوئی تلوار کی دھار (۳۴) فاقہ کش صاحبِ کردار کے چہرے کا وقار
اپنے اعمالِ گزشتہ پہ تفکر فہمی
حسن فاقوں میں بھی بندے کی تشکر فہمی

حسن ہے ڈوبتے سورج تجھے پلٹانا بھی رات میں چھپ کے مدد لوگوں کو پہنچانا بھی
علم کی الجھی ہوئی گرہوں کو سلجھانا بھی (۳۵) ایک ہی وقت میں چالیس جگہ جانا بھی
عمداً لاش بنے شخص کو مردہ کرنا
حسن ہے پھر اُسے ٹھوکر سے ہی زندہ کرنا

دورِ ظلمت میں دیا علم کا روشن کرنا حسن ہے حق کے اصولوں پہ ہی جینا مرنا
شدتِ پیاس میں منھ پھیر کے پانی بھرنا (۳۶) اپنے قاتل سے نہیں ، اپنے خدا سے ڈرنا
حسن اُن میں ہے جو عرفانِ خدا رکھتے ہیں
زندگی کے لیے خنجر پہ گلا رکھتے ہیں

حسن اللہ کے محبوب کی تعظیمِ بتولؑ عصمتی پھول سے مہکی ہوئی آغوشِ رسولؐ
حسن سجدے کو حسینؑ ابنِ علیؑ کے لیے طول (۳۷) مدحتِ پنجتنِؑ پاک میں قرآں کا نزول
سلسلہ حسن کا اِس در سے ہی وابستہ ہے
حضرتِ فاطمہؑ کے گھر سے ہی وابستہ ہے

اس تغیر میں بھی یہ آنکھ جو خوابیدہ ہے زندگی موت کے ہالے میں بھی تابندہ ہے
یہ جو ماضی تھا جو موجودہ ہے آئندہ ہے (۳۸) حسن جو آج بھی اک پردے میں پوشیدہ ہے
یہ خبر دیتا ہے کہ حسنِ مکمل ہے کوئی
پست ہر چیز ہے ، ہر چیز سے افضل ہے کوئی

حسن کا ذکر ہوا آگیا یوسفؑ کا خیال جس میں اللہ کی قدرت کا نظر آیا کمال
دیکھ کر قلبِ زلیخا جسے ہوتا تھا نہال (۳۹) مصر کی عورتوں کا جس کے سبب غیر تھا حال
محوِ حیرت ہوئیں جب حسن کا جلوہ دیکھا
انگلیاں کاٹ لیں یوسفؑ کا جو چہرہ دیکھا

محملِ فکر کو ذیشان بنا دیتا ہے حق کے ادراک کا عنوان بنا دیتا ہے
راہِ احساس کو آسان بنا دیتا ہے (۴۰) حسن انسان کو انسان بنا دیتا ہے
مرحلہ طے ہوا ، انسان مسلمان بنا
حسن کے حسن سے بوذرؓ کوئی سلمانؑ بنا

حسن ، مخلوق پہ خالق کا ہوا لطف و کرم حسن ، معبود کی نظروں میں ہے بندے کا بھرم
حسن ، پیروں میں عبادت کے سبب آیا ورم (۴۱) حسن ، معراج کی منزل میں محمدؐ کے قدم
حسن ، خالق کے قریب اور قریب آنا بھی
دو کمانوں سے بھی کم فاصلہ رہ جانا بھی

حسنِ اول ہے خدا ، اُس کا ارادہ احمدؐ حسنِ اول کا پرُاسرار اشارہ احمدؐ
حسنِ اول کا حسیں تر ہے خزینہ احمدؐ (۴۲) حسنِ اول کو سمجھنے کا ذریعہ احمد
اہلِ حق حسنِ حقیقی کی ادا تک پہنچے
نورِ احمدؐ کے وسیلے سے خدا تک پہنچے

حسنِ کُل خالقِ کونین نے جب یہ چاہا اُس کو پہچانے ، اُسے جانے یہ عالم سارا
اُس کے عرفان کی منزل کرے طے فکرِ رسا (۴۳) حسن کو حسن کے ہی حسن سے سمجھے دنیا
حسن اِس واسطے تخلیق کیا ہے اِن کا
نام طٰہٰ کبھی یاسین لیا ہے اِن کا

خالقِ کُل نے کیا خلقِ محمدؐ سا حسیں طور کا جلوۂ حق جس کی سمیٹے ہے جبیں
حسن کا اپنے بنایا ہے جسے حق نے امیں (۴۴) جس کی توصیف میں نازل ہوا قرآنِ مبیں
ربطِ معراجِ مسلسل کو نہ توڑا جس نے
حسن وہ حسن کہ سایہ بھی نہ چھوڑا جس نے

صدقۂ حسنِ محمدؐ ہے یہ پرُ کیف سماں چاند سورج یہ ستاروں کی حسیں کاہ کشاں
یہ ملائک کا ہجوم اور یہ حورانِ جناں (۴۵) صدقۂ حسنِ نبیؐ ہے یہ زمیں اور زماں
حسن کا نور ، جہاں میں نہ ہویدہ کرتا
یہ نہ ہوتے تو خدا کچھ بھی نہ پیدا کرتا

جامِ خودداری و تہذیب کا پینا سیکھا زخمِ دل ہر دلِ مظلوم نے سینا سیکھا
توڑنا آبِ ہوس سے بھرا مینا سیکھا (۴۶) ان کے صدقے میں ہی انسان نے جینا سیکھا
ان سے پہلے تھا ستم ڈھانا بڑے فخر کی بات
بیٹیاں زندہ ہی دفنانا بڑے فخر کی بات

نورِ احمدؐ کو حسیں تر ہے بنایا حق نے اپنے ہی حسن سے خاص اس کو سجایا حق نے
اپنے نزدیک سرِ عرش بلایا حق نے (۴۷) اپنے محبوب کی عزت کو بڑھایا حق نے
ان کو رحمت کا سبب ، اپنے کو رحمان لکھا
ان کی توصیف میں اللہ نے قرآن لکھا

یہ جو نکھرا ہوا اے وقت ترا چہرہ ہے   یہ جو عالم کا مہکتا ہوا گلدستہ ہے
لہلہاتا ہوا فطرت کا جو سرمایہ ہے (۴۸) حسنِ پیغمبرِ اسلام کا ہی صدقہ ہے

وجہِ تخلیقِ دو عالم ہوئی خلقت ان کی
حسن ہر جا نظر آیا ہے بدولت ان کی

حسنِ یوسفؑ کا جہاں میں جو بہت ہے شہرہ   آج تک جس کا حسیں کرتے ہیں ہر جا چرچا
دیکھ کر ہوش ، زلیخا نے تھا جس کو کھویا (۴۹) جس کو پا لینے کی کوشش میں قدم بھی بہکا

خود اُسی حسن نے توصیفِ محمدؐ کی ہے
حسنِ سرکارِ دو عالمؐ سے تجلی لی ہے

ان کے ہی حسن کے جلوے نے کہانی پلٹی   حق میں حق والوں کے باطل کی نشانی پلٹی
دل کے دریا کی ضعیفی میں روانی پلٹی (۵۰) حسنِ احمدؐ نے زلیخا کی جوانی پلٹی

عشقِ گستاخ بھی شرمندۂ احسان ہوا
حسنِ مرسل پہ خیالوں میں ہی قربان ہوا

حسنِ سرکارِ دو عالمؐ کی نہیں کوئی مثال   جس میں رکھا یدِ قدرت نے بصد ناز کمال
جس پہ آ ہی نہیں سکتا کسی صورت بھی زوال (۵۱) جس کا پرتو نظر آیا علیؑ اکبر کا جمال

حسن سے جس کے ، جہاں حسن کا تابندہ ہے
کربلا میں جو محمدؐ کا نمائندہ ہے

جس کی ہر ایک ادا ، مرسلِ اعظمؐ کی ادا   جس کے رُخ میں ہے نبیؐ کے رخِ زیبا کی ضیا
جس کے انداز ہیں اندازِ پیمبرؐ پہ فدا (۵۲) جس کو اعجازِ تکلم بھی محمدؐ کا ملا

جو سماعت کی فضاؤں میں شکر گھولتا ہے
مثلِ پیغمبرِ اسلام ہی لب کھولتا ہے

ہاں وہ فرزندِ حسینؑ ابن علیؑ رشکِ قمر   دیکھ کر جس کے رخِ پاک کو ہوتی ہے سحر
جس پہ ہر وقت ٹکی رہتی ہے لیلیٰ کی نظر (۵۳) جس کی ہر لمحہ رہا کرتی ہے زینبؑ کو خبر

حسنِ کردار کو اٹھارہ برس ڈھالا ہے
اُم لیلیٰؑ نہیں زینبؑ نے جسے پالا ہے

حق نے بخشا ہے سراپا جسے پیغمبرؐ کا   جس کے پہلو میں دھڑکتا ہے جگر حیدرؑ کا
واقعہ لوریوں میں جس نے سنا خیبر کا (۵۴) سامنا جس نے اکیلے ہی کیا لشکر کا

فوجِ باطل نے بصد خوف زمیں چھوڑی ہے
جس کے فولاد کلیجے نے سناں توڑی ہے

ناز آتے ہیں اٹھانے کے لیے جس کا ملک جس کی تعظیم کی خاطر جھکا جاتا ہے فلک
خوف سے جس کے جھپکتی نہیں اعدا کی پلک (۵۵) جس کے تیور میں ہے عباسؑ کے تیور کی جھلک
جو ضعیفی میں سہارا دلِ شبیرؑ کا ہے
جس پہ حق ماں سے سوا زینبؑ دلگیر کا ہے

حسن پر جس کے تصدق ہے گروہِ خوش نام جس سے حورانِ جناں کرتی ہیں خود آ کے کلام
جس کے چہرے کی زیارت کیا کرتے ہیں امامؑ (۵۶) جس کو عاشور کے سورج نے کیا جھک کے سلام
جس کی آوازِ اذاں سن کے جگر بیٹھ گیا
خاک پر فاتحِ خیبر کا پسر بیٹھ گیا

خاک پر بیٹھ نہ کیوں جائیں شہِؑ جنّ و بشر اُن کو معلوم ہے ڈوبے گا لہو میں منظر
آ کے مرنے کی اجازت وہی مانگے گا پسر (۵۷) جس کی آوازِ اذاں سے ہوئی مقتل میں سحر
فیصلہ سخت یہ کس طرح سے لیں گے شبیرؑ
کیسے اکبرؑ کو رضا مرنے کی دیں گے شبیرؑ

جانبِ شام ہے اب صبح کے سورج کا سفر خوں میں ڈوبا ہوا لہراتے ہیں اعدا خنجر
خیمۂ حق کی طرف لشکرِ شر کی ہے نظر (۵۸) سامنے شاہؑ کے خاموش کھڑے ہیں اکبرؑ
آرزو دل کی یہ ہے باپ پہ فدیہ ہو جائیں
اپنے سر اوڑھ لیں سب آفتیں صدقہ ہو جائیں

دیکھ کر بیٹے کو خاموش کھڑا ، شہؑ بولے اے مرے لال میں جذبات کے تیرے صدقے
مجھ کو معلوم ہے کیوں سامنے میرے ہو کھڑے (۵۹) جنگ کی مانگنے آئے ہو اجازت مجھ سے
پر میں تنہا تجھے کیوں کر دوں اجازت بیٹا
جان پر تیری ہے لیلیٰؑ کو بھی قدرت بیٹا

حکمِ سرورؑ پہ چلے خیمے کی جانب اکبرؑ آ کے خیمے میں کہا تم ہو کہاں اے مادر
آخری بار ملاقات کو آیا ہے پسر (۶۰) مجھ کو مرنے کی اجازت دو مجھے لپٹا کر
سُن کے آوازِ پسر دوڑ کے آئیں لیلیٰؑ
ساتھ میں زینبِ مضطر کو بھی لائیں لیلیٰؑ

رو کے کہنے لگیں یہ حق ہے انھیں بی بی کا میرا کیا ، میں نے تو بس تم کو کیا ہے پیدا
تم کو زینبؑ نے ہی اٹھارہ برس ہے پالا (۶۱) تم کو مرنے کی اجازت یہی دیں گی بیٹا
ذائقہ موت کا تم جاؤ چکھو اے اکبرؑ
پہلے سر پاؤں پہ زینبؑ کے رکھو اے اکبرؑ

حکم جو غم زدہ ماں کا علی اکبرؑ نے سنا جھک کے قدموں میں پھوپھی ، زینبِؑ مضطر سے کہا
دیجیے جلد مجھے نصرتِ سرورؑ کی رضا (۶۲) مقتلِ گرم میں تنہا ہیں کھڑے شاہِؑ ہدا
ظلم میں ایسا نہ ہو اور اضافہ ہو جائے
میں یہاں پر رہوں ، شبیرؑ پہ حملہ ہو جائے

التجا دلبرِ شبیرؑ نے زینبؑ سے جو کی پیٹ کر سینہ و سر بنتِ علیؑ رونے لگی
پھر اُسے چھاتی سے لپٹا کے بصد غم بولی (۶۳) جاؤ بھائی پہ تصدق تمہیں کرتی ہے پھوپھی
سر پہ سہرا نہ سجا پائی میں ، افسوس رہا
تم کو دولھا نہ بنا پائی میں ، افسوس رہا

اذن ماں اور پھوپھی سے جو ملا مرنے کا پیکرِ حسن ، پسر شاہؑ کا مقتل کو چلا
ایک کہرام ہوا خیمے کے اندر برپا (۶۴) بیبیاں تھام کے دامن کو لگیں کرنے بکا
جنگ کے واسطے ایسے علی اکبرؑ نکلے
جیسے خیمے سے جنازہ کوئی باہر نکلے

ہوکے رخصت علی اکبرؑ چلے مقتل کی طرف پہلے حاصل کیا سرورؑ کی زیارت کا شرف
اور ادب سے کیا سر اپنا نگوں سوئے نجف (۶۵) پھر جو حملہ کیا تو ٹوٹ گئی فوج کی صف
غل ہوا رن میں شہِؑ دیں کا پسر آیا ہے
توڑنے فوجِ ستم گر کی کمر آیا ہے

رن میں بیٹے کی وغا دیکھ رہے ہیں شبیرؑ صاف حیدرؑ کی ادا دیکھ رہے ہیں شبیرؑ
رنگ دشمن کا اڑا دیکھ رہے ہیں شبیرؑ (۶۶) تیغ سے بٹتی قضا دیکھ رہے ہیں شبیرؑ
لشکرِ شام پہ غالب ہے پسر مانتے ہیں
شاہ اکبرؑ کی مگر پیاس کو بھی جانتے ہیں

سیر تھی فوجِ عدو ، شاہؑ کا دلبر پیاسا کتنا اس حال میں یہ حسن کا پیکر لڑتا
اک شقی نے اسی عالم میں بڑا وار کیا (۶۷) سینۂ اکبرِ ناشاد پہ نیزہ مارا
وار ایسا ہوا ہاتھوں سے سپر چھوٹ گئی
ہائے اکبرؑ کے کلیجے میں سناں ٹوٹ گی

وار سینے پہ جو ہمشکلِ پیمبر کے لگا رن سے آواز دی اکبرؑ نے سلام اے بابا
سن کے آوازِ پسر دوڑ پڑے شاہِؑ ہدا (۶۸) کہتے جاتے تھے صدا دو ہو کہاں تم بیٹا
راہ اس باپ کو تم کچھ تو دِکھاؤ اکبرؑ
تم گرے ہو کہاں گھوڑے سے بتاؤ اکبرؑ

شہؑ کی آواز پہ لبیک کہا اکبرؑ نے　　بولے مجھ کو یہاں مارا ہے ستم پرور نے
روکنا چاہا شہِؑ دیں کو بہت لشکر نے (۶۹) رن میں بیٹے کو مگر ڈھونڈ لیا سرورؑ نے
پاس آئے تو عجب حالتِ دلبر دیکھی
شہؑ نے برچھی کی انی سینے کے اندر دیکھی

دیکھ کر بیٹے کو ، غم گین ہوئے شاہِؑ ہدا　　ہاتھ سر پر علی اکبرؑ کے محبت سے رکھا
زخم برچھی کا جو سینے میں لگا تھا ، دیکھا (۷۰) یا علیؑ کہہ کے پھر اک بار سناں کو کھینچا
کھینچا شبیرؑ نے سینے سے جو نیزہ باہر
آگیا ساتھ میں اکبرؑ کا کلیجہ باہر

نکلی برچھی کی انی جب تو ہوا حشر بپا　　شدتِ درد سے سرورؑ کا گلِ تر تڑپا
موت کا ماتھے پہ اکبرؑ کے پسینہ آیا (۷۱) حسنِ ہمشکلِ نبیؐ خون میں اپنے ڈوبا
ہائے افسوس جہاں چھوڑ دیا اکبرؑ نے
باپ کی گود میں دم توڑ دیا اکبرؑ نے

شورِ گریہ ہوا ، کربل میں قیامت آئی　　خون آلود نظر حسن کی آیت آئی
موت کی زد میں محمدؐ کی شباہت آئی (۷۲) سرورِؑ دیں پہ ضعیفی میں یہ آفت آئی
نور آنکھوں کا شہِؑ جنّ و بشر کھو بیٹھے
ہاتھ اولاد سے شبیرؑ ، قمؔر دھو بیٹھے

اشاریۂ میر انیسؔ

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

اشاریۂ مرزا دبیرؔ

(زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

کربلا، درد ہی نہیں درس اور دوا بھی

آل رضاؔ کے مرثیہ 'شہادت سے پہلے' کا تجزیہ

لئیق رضوی

بات فروری ۱۹۳۹ء کی ہے۔ ماہ محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی آسمان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زوردار بارش شروع ہو گئی۔ اس بے موسم برسات نے شاعر کے جذبات کو ٹھوکہ لگایا اور بے ساختہ ایک شعر زبان پر جاری ہوا:

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے　اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

خیال نے شعر کا قالب اختیار کر لیا۔ بات مکمل ہو گئی۔ ایک غزل گو شاعر کے لیے یہ تسکین کا موقع ہونا چاہیے تھا مگر یہ کیا کربلا میں دریا کنارے تباہ ہوئی پیاسوں کی کشتی کے درد انگیز خیال نے جزبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تخلیق کی نئی بیار بہنے لگی۔ موسم بدلا اور مزاج بھی۔ تخیل اور تصور کے فلک پر شعور و احساس کی گھٹا چھائی اور ایک اور بارش شروع ہو گئی۔ 'کشت افکار پر الفاظ کی بارش'۔ بے ساختہ اشعار ہوتے اور جڑتے گئے۔ خیالات کے تیز بہاؤ اور جزبوں کی شدت نے اس تخلیقی عمل کو ایک الگ ڈگر اور رفتار بخش دی اور مرثیہ کا ایک نیا چہرہ اور منفرد و مجتہد رشاعر نصیب ہوا۔ یہ تھے سیّد آل رضاؔ (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۸ء) اور مرثیہ ہے 'شہادت سے پہلے'۔

۲۷ بند پر مشتمل آل رضاؔ کا یہ مرثیہ (کلمۂ حق کی ہے تحریر دل فطرت میں) سانحہ کربلا کا ایک مکمل اور موثر منظر نامہ ہے۔ انکار بیعت سے شہادت حسین تک کے واقعیات کو آل رضاؔ نے اس فنکاری اور پرکاری سے بیان کیا ہے کہ یہ سانحہ لفظ در لفظ اور منظر بہ منظر نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔ مرثیہ کا تانا بانا تاریخ اور مقاتل کی روایتوں سے کسا اور بنا گیا ہے۔ کہیں کہیں تخیل اور تصور کی رنگ پاشی بھی ہے، جس نے تاثر اور کیفیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ آل رضاؔ نے اپنا یہ مرثیہ پہلی مرتبہ ۱۳ پریل ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ناظم صاحب کے امام باڑے میں پڑھا۔ اس مجلس میں شہر کے ادب نواز حضرات کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ مرثیہ کے اس نئے رنگ و آہنگ نے دھوم مچا دی۔ بعد میں آل رضاؔ نے اسی تسلسل سے اہلِ حرم کے حال میں ایک مرثیہ 'شہادت کے بعد' کہا۔ یہ دونوں مرثیے ۱۹۴۴ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے۔

وقت کے ساتھ فکر کے زاویے اور پسند، ناپسند کی کسوٹیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ آج کا قاری، ہر بات کو یوں ہی قبول کر لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے اپنے سوال ہیں جن کے وہ جواب چاہتا ہے۔ ہر بات کو وہ منطقی اور سائنسی کسوٹیوں پر پرکھنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی کی وہ بات سننا چاہتا ہے جو اس کے حال سے جڑتی ہو۔ اسے تاریخ کے ان اوراق سے دلچسپی ہے جو اسے آج کی زندگی کے لیے کوئی سبق دیں۔ کوئی راستا سجھائیں۔ وہ، کسی بات کو قبول کرنے سے پہے اس کی عصری معنویت پرکھ لینا چاہتا ہے۔ آل رضاؔ نے اس بات کو سمجھا اور برتا۔ ان کا یہ مرثیہ سانحہ کربلا کا تجزیاتی اور پیغاماتی بیانیہ ہے۔ سانحہ کربلا کی روداد اور اس کی جزئیات کے بجائے آل رضاؔ نے اس کے تاریخی اسباب وعلل اور اس کے لافانی سماجی اثرات، آفاقی پیغامات اور عصری معنویت پر فوکس کیا ہے۔ ان کے پیش نظر تعمیری پہلو ہیں۔ آل رضاؔ سانحہ کربلا اور

شہادت امام حسینؑ میں پوشیدہ حکمت اور اسباق کو شاعرانہ رمزیت اور اشاریت کے ساتھ سامنے لاتے ہیں:

کربلا میں ہوا اونچا جن اصولوں کا علم ان پہ لہراتا ہے ہر وقت حسینیؑ پرچم
ان اصولوں میں ہے ہر مذہب وملت کا بھرم مانتے سب ہیں انہیں کوئی زیادہ کوئی کم
خوبیاں جتنی جہاں تھیں انہیں قوت پہنچی
فیضِ شبیرؑ سے دنیا کو ہدایت پہنچی

درسِ حق دے گیا انسانوں کو کامل انسان کچھ یہی مصلحِ اعظم کی ہوا کرتی ہے شان
کر گیا تزکیۂ نفس کا سارا سامان طبعِ خوددار پہ کیا کم ہے یہی اک احساں
بے حقیقت ستم ایجادوں کی ہستی کر دی
منقلب ذہنیتِ جور پرستی کر دی

ذبح تک جتنے مدارج ہوئے عظمت والے
راستے سب سے نکلتے تھے ہدایت والے

جیسا کہ شاعر نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ مرثیہ کسی منظم تخلیقی منصوبے کی اپج نہیں بلکہ جزبات کی شدت کی پیداوار ہے۔اس لیے اس میں ربط اور تسلسل بھی نہیں۔منظر بار بار بدلتے ہیں۔مرثیے کا چہرہ پیاس سے ابھرتا ہے۔شاعر نے دریا کنارے پانی کی محرومی اور مظلومیت کے بڑے زندہ پیکر تراشے ہیں،لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ نہ تاریخ مجروح ہو اور نہ ہی آلِ نبی کی حرمت اور تقدس پر کوئی حرف آئے۔یہاں پیاس ہے مگر بے قراری نہیں۔ننھے ننھے بچوں کو بھی مقصد اور خانوادے کے مرتبے کا پاس ہے۔نہ کوئی شکوہ اور نہ التجا،نہ بے بسی اور نہ ہی کوئی مایوسی۔جدھر بھی دیکھیے،پروردگار پر مکمل ایمان،اعتماد اور تسلیم ورضا کی جیتی جاگتی تصویریں:

بھولے بھالے وہ کئی روز کے پیاسے بچے ترسی آنکھوں میں کڑھے ہاتھوں میں خالی کوزے
پاس بہتے ہوئے دریا کی صدائیں سن کے دیکھنا چاہنے والوں کی طرف حسرت سے
کہتی تھی بڑھتی ہوئی تشنہ دہانی مانگو
شرم کہتی تھی کہ مر جاؤ نہ پانی مانگو

کربلا میں حق وباطل کے علمبرداروں کے چہرے اور موقف کے تعارف کے لئے شاعر قاری یا سامع کو اب پس منظر (فلیش بیک) میں لے جاتا ہے۔آخر تاریخ انسانیت کس موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھی؟ وہ کون لوگ تھے جنھیں دریا کنارے پیاسا قتل کر دیا گیا؟ کس نے قتل کیا اور کیوں؟ آخر کربلا کی نوبت ہی کیوں آئی؟ یزید کیوں بیعت چاہتا تھا اور امام حسینؑ نے کیوں انکار کر دیا تھا؟ آگے کے بندوں میں یہ اور ایسے بہت سے سوالوں کے جواب خود بخود سامنے آجاتے ہیں:

منتظر وقت کو تھا ایسے ہی ایثار سے کام ارتقا دو نظریوں کا ہوا طشت از بام
ایک اسلام سے منسوب حکومت کا نظام دوسرا موردِ آلام حقیقی اسلام
ایک سر چڑھ کے یزیدِ اموی میں ابھرا
دوسرا پس کے حسینؑ ابنِ علیؑ میں ابھرا

فخر پہ فخر جسے حاملِ دیں حق آگاہ   نہ دلِ عیشِ دو روزہ نہ سرِ تاج و سپاہ
وہ ڈرے اور اسے دھمکائے یزید گمراہ   توبہ !لاحول و لا قوۃ الا باللہ
جادۂ حق سے سر مو بھی کنارا نہ کیا
نہ کیا بیعتِ فاسق کو گوارا نہ کیا
کیوں نہ ہو کس کا نواسہ تھا امامؑ ابن امامؑ   گود میں کس کی پلا تھا وہ شہؑ عرش مقام
کس کا آغاز محبت تھا شہادت انجام   کس کی تعلیم کا بنا تھا مجسم پیغام
اپنے ناناؐ کا جو مسلک تھا نہ اصلا بدلا
انقلاب آئے ہزاروں نہ ارادہ بدلا

آلِ رضاؔ نے کردار نگاری کو بھی ایک جداگانہ آہنگ بخشا ہے۔ ڈرامائی انداز کے بجائے ان کے یہاں جزبات نگاری پر زور ہے، جس سے کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات اپنے تمام رخوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ ان موقعوں پر آلِ رضاؔ نے عقیدت کے ساتھ ساتھ عقل اور منطق کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ یہی منطقی رویے اور انداز نئے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ رزمیہ نگار کے سامنے بنیادی مسئلہ، ہیرو اور ولن کا تعارف ہے۔ سانحہ کربلا کے دلوں میں بسے ہونے سے مرثیہ نگار کو اس ضمن میں زیادہ زور آزمائی نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن آلِ رضاؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان مانوس کرداروں کی ایسی بولتی ہوئی تصویریں بنائی ہیں کہ ظاہر ہی نہیں باطن بھی سامنے آگیا ہے:

اس کو یہ کد کہ نیا دین کا افسانہ بنے   اس کو یہ فکر کہ اسلام تماشہ نہ بنے
اس طرف یہ کہ مٹا ڈالو جو ویسا نہ بنے   اس طرف وہ بھی نہیں غیر جو اپنا نہ بنے
زعم اس کو کہ ابھی چوٹ کڑی باقی ہے
ناز اس کو کہ حسینؑ ابنِ علیؑ باقی ہے
لے کے بیعت اسے مقصود تھا رسوا کرنا   منزلِ آلِ محمدؐ تہ و بالا کرنا
ان سے جو نام تھا زندہ اسے مردہ کرنا   شاہِؑ دیں اور یہ تذلیل گوارا کرنا؟
چاندنی رات کہاں تک شبِ دیجور بنے
کہہ کے دیکھے کوئی سورج سے کہ بے نور بنے

مرثیے کے ۲۰ ویں بند سے منظر ایک بار پھر بدلتا ہے۔ اب حالات حاضرہ پر امام حسینؑ کے احساس کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اپنی ذمے داریوں کا بھرپور احساس، حق اور انصاف کی حفاظت کے لیے جان ہتھیلی پر لے کر نکل پڑنے کا عزم محکم، نہ ممکنہ خطرات کا کوئی خوف، نہ کوئی اندیشہ، فکر ہے تو صرف اللہ کی خوشنودی کی۔ یہاں انداز خود کلامی کا سا ہے:

میرا جد اور وہ تجدید ظہورِ اسلام   ظلمتیں ہوتی تھیں کافور حضورِ اسلام
فطرتِ سادہ کو چمکاتا تھا نورِ اسلام   وہ خدا ساز اصول اور وہ شعورِ اسلام
ذکرِ قرآں نہ رہا عزتِ عترت نہ رہی
ظاہری شان میں ایمان کی قوت نہ رہی

ہم کو اللہ نے پیدا کیا حق گو آزاد دیکھ لے دیدۂ انصاف غریبوں کا جہاد
درسِ حق دیتی ہے کس طرح نبیؐ کی اولاد دین قائم رہے ہوتے ہیں تو ہم ہوں برباد
عزم راسخ ہو تو دو چار بھی دم کافی ہیں
میں مرے بچے مرے اہل حرم کافی ہیں
عزم کا نقص ہے افراد کی قلت کا خیال صرف درکار ہے مقصد کی صداقت کا خیال
جس کو دیکھو وہ لیے بیٹھا ہے دہشت کا خیال یوں نہیں بنتے کا بگڑی ہوئی ملت کا خیال
کام اسلام کا تعلیم سے انسانوں کی
ذہنیت پھر بدلنا ہے مسلمانوں کی

یہ سلسلہ آگے کے ۱۱ بند تک یوں ہی جاری رہتا ہے۔اس کے بعد آلِ رضاؔ نے امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑنے کا منظر نظم کیا ہے۔یہاں بھی جذبات کی شدت ہے۔بند ملاحظہ فرمائیں:

اسی دھن میں شہِؑ ابرار مدینے سے چلے غازۂ فخر امانت رخِ انور پہ ملے
ساتھ کچھ بی بیاں کچھ بچے مرادوں کے پلے ظلم ڈھانا بھی ذرا جن پہ لعینوں کو کھلے
تو سہی خود ہی تماشائی بسمل رودے
مار کر تیر سے ششماہے کو قاتل رودے

کربلا، تاریخ انسانیت کا عجب معرکہ تھا۔ایک طرف فوج آرائی ہے دوسری طرف مٹھی بھر لوگ۔ان میں بچے بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔امام حسین نے عجب شان کی تیاری کر رکھی تھی۔نہ طاقت کا خوف، نہ ہتھیاروں کی ہوڑ،ظلم و جور کے سامنے صبر و ایصار،تلوار کے سامنے کردار، برچھی کے سامنے سینۂ اکبرتو تیر کے سامنے گلوئے اصغرؑ۔آل رضاؔ نے ان تمام صورتوں کو بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے:

اور وہ صابر و شاکر میرا مظلوم آقا بات کا اپنی دھنی کام کا اپنے پکا
کوہِ ثابت قدمی پیکر تسلیم و رضاؔ اس سے بڑھ کر بھی مصیبت سے نہ ڈرنے والا
راست بازی کا سبق سب کو سکھانے کے لیے
آستیں الٹے تھا گھر بار لٹانے کے لیے
قافلہ منتخب افراد کا لشکر نہ سپاہ اور جو آتا ہے رخصت اسے کر دیتے ہیں شاہؑ
ڈال کر شکر گزاری سے محبت کی نگاہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہتے ہوئے انا للہ
انتہا ہو چکی ہے بے سر و سامانی کی
جا کے تکمیل کیے دیتے ہیں قربانی کی

اس کے بعد میدانِ کربلا کا منظر ہے۔امام حسینؑ نے ایک شب کی مہلت لی۔دونوں طرف تیاریاں ہو رہی ہیں۔یذید کے لشکر میں اسلحے درست کیے جا رہے ہیں،تلواریں تیز کی جا رہی تھی،تو ایک کونا عبادتوں سے گلزار ہیں۔آلِ رضاؔ نے تفصیل میں جائے بغیر چند کلیدی اشاروں سے نہ صرف بات مکمل کر لی ہے بلکہ وہ پورا منظر متحرک کر دیا ہے:

شبِ عاشور کے دل میں وہ سماتی ہوئی شان   فتنۂ خوف کو یک لخت سلاتی ہوئی شان
اپنے پروانوں کو سمجھا کے بجاتی ہوئی شان   شمع گل کر کے یہ انداز دکھاتی ہوئی شان
اپنے ہی دل کی طرف اہلِ مروت دیکھیں
دل پگھل جائیں گے صابر کی نہ صورت دیکھیں
کر کے اپنی جگہ تکمیلِ توکل بخدا   آنچ میں کستا تھا سونے کو پرکھنے والا
لشکری جنگ سے تھا ظاہر و باطن میں جدا   معرکہ جان کھپا کر جسے سر کرنا تھا
رات بھر مدِّ نظر روح کی بیداری تھی
جس طرح کی تھی مہم ویسی ہی تیاری تھی

صبح تک کوئی ریاضت کا نہ گوشہ نہ چھوٹا
تیر آئے تو نمازی سے مصلیٰ چھوٹا

منظر پھر بدلتا ہے۔شب بیتی اور ہم شکلِ نبیؐ کی اذان نے روزِ عاشور کی آمد ہی نہیں قربانی کے آغاز کا اعلان بھی کر دیا۔ یہاں حی علیٰ کا ٹکڑا بہت معنی خیز ہے، شاعر کہنا چاہتا ہے کہ یہ نماز ہی نہیں حق پر جان دینے کی بھی دعوت تھی۔ادھر نماز شروع ہوئی، ادھر دشمنوں کے ہنگامے:

شاہزادے کی اذاں سے متحرک تھی فضا   بج چکا گونج 'حیّ علیٰ' کا ڈنکا
کر چکے شاہؑ مصلے کے فریضے کو ادا   آ گیا وقت عمل ، لختِ دل احمدؐ کا
دف بجاتے ہوئے اس سمت سے بے پیر چلے
اس طرف ہاتھوں میں قرآں لیے شبیرؑ چلے

قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔انصار کے بعد اقربا نے جامِ شہادت نوش کیا۔امام حسینؑ نے ناناؐ کی ریاضت کو اپنے خون سے سینچا:

چمن حق میں دیا سینہ اکبرؑ کا لہو   بازوئے حضرت عباسؑ دلاور کا لہو
سرِ قاسمؑ کا گلوئے علی اصغرؑ کا لہو   جتنا باقی رہا اپنے تنِ لاغر کا لہو
خون دے دے کے ہرا گلشنِ اسلام کیا
تھا جو ناناؐ کا نواسے نے وہی کام کیا

آلِ رضاؔ ایک عام راوی کی طرح صرف واقعات کا بیان کرنے کے بجائے ان پر ناقدانہ تبصرے کرتے ہوئے بھی چلتے ہیں۔ان یہی ناقدانہ بصیرت سانحہ کربلا کے تمام پہلوؤں کو پوری آب وتاب کے ساتھ قاری کے سامنے لے آتی ہے۔اس مرثیے میں احساس کی کئی لہریں ایک ساتھ رواں دواں ہیں۔کچھ تیز اور کچھ ہولے ہولے۔ یہ مرثیہ تاریخ انسانیت کے سب سے دردناک سانحے پر ماتم ہی نہیں امن و انسانیت کے لیے امام حسینؑ کی عظیم اور تاریخ ساز قربانیوں کا اعتراف اور سپاسنامہ بھی ہے:

خون میں ڈوبی ہوئی درد کی تصویر حسینؑ   دل پہ کھائے ہوئے زخمِ تبر و تیر حسینؑ
بگڑے اسلام کے افعال سے دلگیر حسینؑ   اس اندھیرے میں بھی اسلام کی تنویر حسینؑ

تیرا حق ہے کہ تجھے یاد کیا ہی جائے
نام لینے کی طرح نام لیا ہی جائے
کون صابر؟ جو رہِ حق میں ہوا سر افراز صبر پر جس کے ہے خود ممتحنِ صبر کو ناز
امتحاں ہوتا تھا یا ہو رہے تھے راز و نیاز ہر جفا پر تھا نئے بابِ وفا کا آغاز
تیر آتے رہے ، روکی نہ سپر آنکھوں پر
جو بلا آئی وہ لی شوق سے سر آنکھوں پر
کس کی ہمت ہے جو ایک ساتھ یہ سب ظلم سہے سامنے یاور و انصار ہوں ٹکڑے ٹکڑے
دیکھے پیری میں جواں بیٹے کے برچھی لگتے باپ کی گود ہو اور تیر پڑے بچے کے
ہوش کس کے رہیں ایسی جو مصیبت آئے
رات ہو جائے اگر دن پہ یہ آفت آئے

آلِ رضاؔ نے اپنے اس مرثیے میں امامِ مظلومؑ کے جاں نثار ساتھیوں کی مجاہدانہ امنگوں اور حوصلوں کی بھی انتہائی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ ان اشعار میں بوڑھے مجاہدوں کی جواں مردی بھی عیاں ہے اور بچوں کے بڑے ارادے بھی:

ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہر اک جانباز پیروی اور قیادت کا وہ دلکش انداز
ایک دل ایک زباں ایک خیال اک آواز جس طرح ہوتی ہے اک ساتھ جماعت کی نماز
مر مٹیں حق پہ یہ جی توڑ کے ہمت باندھی
جانکنی میں بھی نہ ٹوٹی جو وہ نیت باندھی
ضعفِ پیری میں بھی بوڑھوں میں تھی اتنی ہمت رعشہ ہاتھوں کا بڑھاتا تھا عمل کی طاقت
گرم خوں میں تھی جوانوں کے کچھ ایسی حدت آنچ پہ تیغوں کے چھا جاتی تھی جس کی ہیبت
سن چکے تھے جو یہی ماؤں سے گہواروں میں
بچے ضد کرکے چلے جاتے تھے تلواروں میں
ہر مجاہد پہ تھا اک کیفِ شہادت طاری شکر کرتا تھا وہ آجاتی تھی جس کی باری
تھی عجب قلّتِ تعداد پہ بھی تیاری جتنا کم ہوتے تھے بڑھ جاتی تھی ذمے داری
ایک سے ایک کی بڑھ چڑھ کے شہادت نکلی
دم لیا جاکے جہاں سب نے وہ جنت نکلی

اس مرثیے میں سراپا ہے، رجز اور جنگ بھی مگر بدلے ہوئے رنگ و آہنگ میں۔ گھوڑے کے چھل بل، تلوار کی کاٹ، زورِ بازو اور فنِ سپہ گری پر زور صرف کرنے کے بجائے شاعر نے میدان کربلا کے وہ منظر دکھائے ہیں، جہاں امامِ مظلومؑ بھٹکے ہوؤں کو راہ حق پر لانے کا انتہائی جتن کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نشانے پر ظلم ہے، ظالم نہیں۔ مدمقابل کھڑے دشمنوں میں رشد و ہدایت کے منظر۔ گلے پر کند چھری پھیرتے شقی کے لیے بھی دعاؤں کے سبق آموز منظر:

بیکس و تشنہ کا وہ ذبح سے پہلے حملہ   کوئی کہتا ہے تو کیا اس میں تعجب کی ہے جا
مسئلہ شرع کا اس وقت کسی نے پوچھا   رک گئی تیغ بہا فقہ کا ٹھہرا دریا
مدعا یہ تھا کہ ہر چند لبوں پر دم ہے
جنگ اسی کے لیے تھی پوچھ لو فرصت کم ہے

ہاشمی لہجے میں خطبہ سرِ میدانِ وغا   ہادیٔ دیں کے لیے زیں فرسِ منبر تھا
پاکے خود اپنی شجاعت سے فصاحت کا صلہ   حق نصیحت کا کیے جاتا تھا جانباز ادا
سامنے رکھ دیے تبلیغ کے جو دفتر تھے
کبھی قرآن تھا ہاتھوں پہ کبھی اکبرؑ تھے

تنِ صد پاش پہ وہ اپنے بزرگوں کا لباس   کہیں اکبرؑ کا لہو اور کہیں خونِ عباسؑ
خون میں دودھ ملا، تیر کے ایک زخم کے پاس   زیبِ آغوش خزاں دیدہ گلوں کی بو باس
زخمِ بازو میں گلوئے علی اصغرؑ کی طرح
گھاؤ سینے میں لیے سینۂ اکبرؑ کی طرح

ختم سب یاور و انصار بدن زخموں سے چور   مستقل اپنے ارادے میں مگر طبع غیور
رنگ لائی ہوئی مظلوم کی سعیِ مشکور   خاک اور خون بھرے چہرے پہ تکمیل کا نور
محویت یہ کہ یونہی قربِ خدا ہوتا ہے
تقویت یہ کہ بڑا فرض ادا ہوتا ہے

سامنے بے کسیٔ اہلِ حرم کا نقشہ   آخری جن کا سہارا بھی، گرفتارِ بلا
بی بیاں در پہ، درِ خیمہ کا ہلتا پردہ   مرنے والے کا اشارہ کہ خدا کو سونپا
دل میں اسلام کے ناسور ہے بھر جانے دو
جاؤ تم قید میں جاؤ مجھے مر جانے دو

یہ بین کا موقع ہے۔ روایتی مرثیے میں اس منزل پر مرثیہ نگار شعوری طور پر بیان میں درد انگیزی پیدا کر کے آہ وزاری کے موقع فراہم کرتا رہا ہے لیکن آلِ رضاؔ نے جزیات میں جانے کے بجائے نفسیاتی پہلو ابھار کر دلوں پر دستک دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مقصدیت کو یہاں بھی فوقیت حاصل ہے۔ مرثیے کا یہ آخری بند ملاحظہ ہو:

بد دعا سننے کی دہشت میں جو روکا خنجر   کچھ عجب قاتلِ بد بخت نے دیکھا منظر
بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں محبت کی نظر   خون دیتے ہوئے ہونٹوں پہ دعاؤں کے گہر
دلِ بے کینہ اسی لو میں کھنچا آتا ہے
پھول مرجھا کے بھی خوشبو ہی دیے جاتا ہے

کربلا حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ امام حسین نے اسلام کی نقاب ڈال کر انسانیت پر ڈاکہ ڈالنے والے ظالم کو رہتی دنیا تک

بے نقاب کر دیا۔ پہلے کربلا، ظلم کی انتہا اور حسین مظلومیت کے استعارے تھے، لیکن آلِ رضاؔ نے کربلا کو حق کی للکار اور امام حسینؑ کو ایک ایسے انسانی مجاہد کے روپ میں پیش کرتا ہے جو ظلم کے خنجر کو رگ گلو سے کاٹ دیتا ہے۔ جس نے اپنے خون سے ایصار و قربانی کی ایک نئی تاریخ لکھ دی:

سر دیا اس نے دم عصر دعائیں دے کے ظہر تک جس نے اٹھائے تھے اکہتر لاشے
ظلم بے جا کو تھکا مارا بڑی محنت سے سبق آموز عمل تھا یہ ہمارے ہی لیے
کس مشقت سے ہدایت کا سر انجام دیا
اے مرے سیّدِ مظلم بڑا کام کیا

خون سے اپنے وہ لکھا کہ قلم توڑ دیا
واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کا رخ موڑ دیا

حق کی اس فتح میں باطل کی وہ پسپائی ہے
سر نگوں خود ہی نشان ستم آرائی ہے

آلِ رضاؔ نے جہاں اسلامی احکام و اقدار کی ترجمانی کی ہے وہیں سماج کے ان کالے کونوں، ذہنوں اور سوتوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جو دنیا کو جہنم بنا دینے پر آمادہ ہیں۔ ان کے نشانے پر سرمایہ دارانہ نظام بھی ہے اور ظلم کے آگے سر نیوڑھا دینے والے لوگ بھی۔ یہ اشعار تاریخ کے اس ستم ایجاد دور کا موثر بیان ہے، جس نے بالآخر سانحہ کربلا کو جنم دیا لیکن ذرا غور سے دیکھیئے تو اس میں عصر حاضر کی کروٹیں اور جھلکیاں بھی نظر آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ وقت کے یہ معنی خیز سوال اور زندہ صورتیں اس مرثیے کی عصری معنویت پر بھی دلیل ہیں:

دیکھی جاتی نہیں دولت کی ستم ایجادی نام اسلام کا اور شان ہو استبدادی
بیچے کس طرح غریبوں کا ضمیر آزادی کلمہ حق کا ہے اک سہا ہوا فریادی
ہمتیں ظلم کی بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں
ندیاں فسق کی چڑھتی ہی چلی جاتی ہیں

بے دھڑک لوٹ مچائے ہوئے دنیا کا وبال ہاتھ جس شخص کے جو آئے وہ اس پر ہو حلال
سر بسر جھوٹ، دغا، مکر کا پھیلا ہوا جال ظلم کی حشر خرامی سے تمدن پامال
مشق بے وجہ بھی ہوتی ہے ستمگاری کی
وحشت انگیز ڈھٹائی ہے سیہ کاری کی

سارقِ حق کے کفِ شوم پہ دولت کا چراغ دلِ تاریک میں خاموش ہمیت کا چراغ
آگ دنیا میں لگاتا ہوا طاقت کا چراغ خونِ انساں کی چراہند، حکومت کا چراغ
جس کو پایا اسے بے خوف و خطر پھونک دیا
شعلہ اونچا ہوا اس درجہ کہ گھر پھونک دیا

دین نے جس کو دبایا تھا وہ دنیا ابھری دین کے بھیس میں ابھری ہے تو کیا کیا ابھری
کفرِ سابق سے ملی دل میں تمنا ابھری تہہ کی کہنے لگیں موجیں سرِ دریا ابھری
پانی مرنے لگا تعمیروں پہ آفت آئی
اف! نشیب اتنا کہ طوفان کی نوبت آئی

یہ مسلمان ہیں سر پاؤں پہ ظالم کے دھریں حق کو بھولے رہیں دم اس کی محبت کا بھریں
اس کی مرضی پہ جئیں اس کے اشارے پہ مریں کم سے کم ڈر ہو یہ اس کا کہ خدا سے نہ ڈریں
حشر کو مان کے بھی حشر کی پروا نہ رہے
جرم میں جرم کے احساس کا دھڑکا نہ رہے

عصری آگہی اور حسیت جدید مرثیے کا خاصہ ہے۔جوشؔ سمیت اکثر و بیشتر جدید مرثیہ گو شعرا نے کربلا کو بڑی حد تک سیاسی اور سماجی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔آلِ رضاؔ بھی مرثیے کے سماجی سروکار اور اس کی عصری توجیہ کے قائل ہیں لیکن ان کے یہاں یہ فکر و احساس اسلامی روح کے ساتھ جلوہ گر ہے۔اس مرثیے میں قرآن و حدیث کا عرفان بھی ہے اور اسلامی فکر و فلسفہ کی دانشورانہ نمود بھی:

چھا گئے کثرتِ باطل پہ تماشہ دیکھو
ایک کے ماننے والوں کا کلیجہ دیکھو

مست دنیا طلبی موت سے ڈر جاتے ہیں
جو مسلماں ہیں اس شان سے مر جاتے ہیں

ذکرِ کربلا کے مخالف کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ان کے اپنے سوال ہیں اور دلیلیں بھی۔آلِ رضاؔ نے اپنے اس مرثیے میں ذکرِ کربلا کی اہمیت،ضرورت اور افادیت پر استدلال کرتے ہوئے اس کے منکروں کو خوب آئینہ دکھایا ہے:

اے مرے محسنِ عالم ترے قربان رضاؔ کیا؟ مسلمان بھی ہو سکتا ہے دشمن تیرا
غیر مسلم کی زباں پر بھی رہے مدح و ثنا کلمہ گو ترے ناناؐ کا کرے تجھ سے دغا
کون سی آگ ہے؟ جو دل میں بھڑک اٹھتی ہے؟
کون دکھتی ہوئی رگ ہے جو پھڑک اٹھتی ہے؟

دیکھا آپ نے یہاں آلِ رضاؔ نے کتنے لطیف اشارے کیے ہیں۔یہ سوال بھی ہیں اور جواب بھی۔بغیر کچھ کہے انہوں اتنا اور ایسے کہہ دیا ہے کہ قاری یا سامع سوچتا چلا جائے۔آلِ رضا یہیں نہیں رکتے، بلکہ آگے بڑھکر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ:

کچھ نہیں ضد ہے،فقط ضد کے سوا کچھ بھی نہیں عقل کا پھیر ہے ورنہ بخدا کچھ بھی نہیں
کون کہہ سکتا ہے؟ تعلیم عزا کچھ بھی نہیں کیا؟ یہ فیضِ غمِ شاہِؑ شہدا کچھ بھی نہیں
ایک مرکز پہ کھنچ آنے کا ٹھکانا ہو جائے
دل میں وہ درد ہو ہمدرد زمانہ ہو جائے

اختلافات مٹانے کی ہے حکمت اس میں دلگدازی ہے پئے درسِ شجاعت اس میں
دل کو ملتی ہے ایثار کی کی رفعت اس میں کربلا والوں سے ہوجاتی ہے قربت اس میں
اس بلندی پہ ہر ایک چیز چمک جاتی ہے
قربِ خورشید سے ذرّوں میں چمک آتی ہے

یہ سب کہتے ہوئے آلِ رضاؔ ایک بنیادی نکتہ بھی بیان کرتے ہیں:

شرط لیکن ہے کہ اس ذکر کی حرمت بھی رہے

آلِ رضاؔ یہیں نہیں رکتے۔ذکرِ حسینؑ کی حرمت اور مقصدیت پر اصرار کرتے ہوئے انہوں نے ایک چبھتا ہوا سوال ہمارے سامنے بھی کھڑا کردیا ہے:

دوستی کا ہمیں دعویٰ ہے تو ہم کیا کرتے ہیں
کیا 'حسینؑ' اسی حالت میں جیا کرتے ہیں

زبان وبیان کی سطح پر بھی یہ مرثیہ خاص ہے۔روزمرہ کوانہوں نے فنی چابدستی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ آلِ رضاؔ کا فنی ریاض غزل میں تھا۔یہ مشق، یہ غزلیہ تہذیب جابجا اس مرثیہ میں بھی در آئی ہے۔وہی چست بندشیں، وہی رمزیت واشاریت اور وہی کاٹ بھی۔نئی ترکیبیں وضع کیں۔محاوروں کا برمحل اور فنکارانہ استعمال کیا۔اس میں جزبوں کی طہارت ہے،عقیدت کا نور اور ادبیت کا شعور بھی۔

آلِ رضاؔ کے اس مرثیے نے مرثیہ گوئی کے روایتی ڈھرے کو ہی نہیں اس کے ایجنڈے کو بھی بدلا۔درد کے پہلو کے ساتھ ساتھ انہوں نے سانحہ کربلا میں پوشیدہ تعلیمات اور اس کی آفاقی قدروں کو بھی انڈرلاین کرنے کی کامیاب جستجو کی۔اپنی بات پہچانے کے لیے انہوں نے مخصوص علامتوں اور استعاروں کا فنکارانہ اور کارآمد استعمال کیا ہے۔یہی کوششیں اور انداز انہیں ایک الگ پہچان اور بلند مرتبہ دیتے ہیں۔

جدید مرثیہ کا نقطہ آغاز جوشؔ ملیح آبادی کے 'آوازۂ حق' کو مانا جاتا ہے لیکن خود جوشؔ اس طرزِ نو کا موجد آل رضاؔ کو قرار دیتے ہیں:

'یہ تاجِ فخرِ قدرت نے سیّد آلِ رضاؔ کے واسطے عطا کر رکھا تھا۔وہ اس میدان میں آئے تو حسینیؑ کردار کو سامنے لائے اور مومنین کو یہ تعلیم دی کہ عزت کے ساتھ ایک آن جینا بے عزتی کے ساتھ ہزاروں برس جینے سے بمراحل بلند ہوتا ہے۔اور سچ پوچھیے تو میرے دوست رضاؔ صاحب کا یہ ایک عظیم کارنامہ اور قوم پر ایک عظیم احسان ہے جس کو فراموش کیا ہی نہیں جاسکے گا۔مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد بھی جب صحیح مرثیوں کا ذکر چھڑے گا تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے۔دیکھو یہ آلِ رضاؔ کا وہ منارۂ تجلّی ہے جس نے ہم سب کو راستہ دکھایا۔یہ ہمارا ہادی، ہمارا پیشوا اور یہ ہمارا امیر کارواں ہے۔' (عظمتِ انساں، تعلیمی پریس لاہور، ص ۱۰۲)

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آل رضا کا یہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔اردو کی رثائی شاعری میں یہ ایک انقلاب لیکر آیا۔یہ ایک نیا تجربہ تھا،فکر کی سطح پر بھی اور تخلیقی اپج اور عمل کی سطح پر بھی۔انہوں نے بیس مرثیے کہے ہیں اور یہ سبھی اسی نہج کی توسیع ہیں۔آلِ رضاؔ کی فکری جدتوں اور فنی ندرتوں نے مرثیے کے روایتی قصر میں نئے دریچے وا کیے۔نئے فکر وشعور نے راہ پائی۔عصری احساسات اور تقاضوں نے اندر

جھانکا۔انہوں نے مرثیہ کوایک نئی تہذیب، نئی ترتیب، نئی تنظیم اورنئی زندگی اور بالیدگی بخشی۔ ذکرکربلا درحقیقت درد کا حوالہ بھرنہیں، یہ رہتی دنیا تک ہردور کےظلم اورظالم کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے۔ایک مسلسل اورموثر احتجاج۔ یہ مرثیہ بھی اسی انسانی اورآفاقی احتجاج کوزبان دیتاہے۔ یہ مرثیہ دردکربلا ہی نہیں، درسِ کربلا سے بھی عبارت ہے۔درس امن وانسانیت کا اوردرماں مسائل دوراں کا۔

اس میں زندگی کے تمام رنگ اپنی خوبیوں اورخرابیوں کے ساتھ جلوہ گرہیں۔سماج ہی نہیں، اس میں دل کے اندھیروں کی طرف بھی انگلی اُٹھائی گئی ہے۔ یہ مرثیہ،شہادت کے پُردرد بیان کے بجائے،مقصدِ حسینؑ پر زوردیتاہے۔اس کے مضمرات کوترجیح دیتاہے۔آج کی دنیا کے لیے، حسینؑ اورذکرِ حسینؑ کی معنویت کو انڈرلائن کرتاہے۔اوران خوبیوں نے مرثیے کی پہنچ اورکاٹ میں اضافہ کردیاہے۔اسے،نئی وسعت سے ہمکنارکیاہے۔اس کے نئے تیورنے اسے مجلسوں کےساتھ ساتھ،مفکروں تک پہنچادیاہے۔اس کی پہنچ اورقبولیت بڑھی ہے۔ یہ مرثیہ کی کامیابی ہےاوراس کی زندگی کا ثبوت بھی۔آلِ رضاؔ نے امام حسینؑ کوانقلابی ہیرو کی صورت میں پیش کیاہے۔آہ وبکا کے بجائے تاسیِ حسینؑ کو مرکزیت دی۔کربلا کا منظرنامہ پیش کرتے وقت اس کے پس اور پیش منظرکوبھی سامنے رکھاہےاورانھیں خوبیوں نے مرثیہ کا پلہ گراں کردیا ہے۔ پہلے کربلا،ظلم کی انتہا اورحسینؑ مظلومیت کے استعارے تھے،لیکن آلِ رضاؔ اوردیگرجدیدمرثیہ گوشعرا نے کربلا کوحق کی للکاراورامام حسینؑ کوایک ایسے مجاہد کے روپ میں پیش کرتاہے جوظلم کے خنجرکورگ گلو سے کاٹ دیتاہے۔

جدیدمرثیہ کا انفرادی امتیازاس کارجائی آہنگ ہے۔ یہ،انسان اورانسانیت کے خلاف ہونے والے ہرظلم کے خلاف احتجاج کررہاہے۔ یہ امن اورمساوات کا داعی ہے۔ پہلے کربلا،ظلم کی انتہا اورحسین مظلومیت کے استعارے تھے،لیکن جدیدمرثیہ نے کربلا کوحق کی للکاراور حسینؑ کوایک ایسے مجاہد کے روپ میں پیش کرتاہے جوظلم کے خنجرکورگ گلو سے کاٹ دیتاہے۔ یہ بتاتاہے کہ اگرحسینؑ نے کربلا میں رگ توڑ نہ دی ہوتی توظلم اورملوکیت کی آندھی انسانیت کونگل گئی ہوتی۔ یہ یقین بھی کہ ظلم جب، جب سراٹھائے گا،حسینؑ کی یہ عظیم قربانی اس کے سامنے حوصلوں کا نیالشکرکھڑا کردے گی۔

مقصدیت پرزور،رجائی آہنگ اورعصری احساس کی شمولیت سے مرثیہ کا کینوس بڑاہواہے۔اس میں زندگی کے بہت سے رنگ، بہت سے جزبےاورمیلان اپنی خوبیوں اورخرابیوں کے ساتھ جلوہ گرہیں۔سماج ہی نہیں، اس میں دل کے اندھیروں کی طرف بھی انگلی اٹھائی گئی ہے۔صرف انگلی ہی نہیں اٹھائی گئی، بلکہ پیغام کربلا کی روشنی میں ان کے علاج کے نسخے بھی مہیا کردئے گئے ہیں۔جدیدمرثیہ اسباب کربلا کا معلم،اقداروافکارحسینی کا مفسراورظلم کے خلاف جہدمسلسل کا مبلغ ہے۔ یہ عصرحاضرمیں امام حسینؑ کی ضرورت اورذکرِ حسینؑ کی معنویت کوبخوبی انڈرلائن کرتاہے۔اس نئے تیور سے نہ صرف مرثیہ کی کاٹ بڑھی ہے، بلکہ اس کی پہنچ اورمقبولیت میں بھی اضافہ ہواہے۔ یہ مرثیے کی کامیابی ہےاورذکرِ حسینؑ کی آفاقیت کا بولتاہواثبوت بھی۔

❁❁❁❁

گوشۂ اشفاق نجمی

مرثیہ

عابدؑ عزائے شاہ کے موتی لٹا چکے (۱) چالیس سال خون کے آنسو بہا چکے
نوحوں سے شاہِؑ والا کی مجلس سجا چکے سینہ زنی سے عرشِ معلیٰ ہلا چکے
آنکھوں میں ہر شہید کا پیکر لیے ہوئے
قلب و جگر پہ داغ بہتّر لیے ہوئے

کرب و بلا کے بعد کہاں مسکرائے ہیں (۲) بادل غمِ حسینؑ کے چہرے پہ چھائے ہیں
دل کے لہو کو آنکھوں کے رستے بہائے ہیں بابا کی پیاس سینے سے اپنے لگائے ہیں
قصدِ نماز میں بھی عجب حال ہوگیا
آنسو گرے تو آبِ وضو لال ہوگیا

اُس یومِ غم کے مہر کا ڈھلنا نہ پوچھیے (۳) بعدِ حسینؑ خیموں کا جلنا نہ پوچھیے
بیووں پہ تازیانوں کا چلنا نہ پوچھیے زینبؑ کا سر برہنہ نکلنا نہ پوچھیے
سجادؑ کو اُٹھالیا خیموں کی آگ سے
اسلام کو بچا لیا خیموں کی آگ سے

سہ روزہ بھوک پیاس کی شدت کو کیا کہیں (۴) ہر سرفروشِ شہؑ کی ، شہادت کو کیا کہیں
جلتے ہوئے خیام کی، حِدّت کو کیا کہیں دُروں سے چیختی ہوئی عترت کو کیا کہیں
بیمارِ غم کو اس طرح قیدی بناتے ہیں
گردن میں طوق پاؤں میں بیڑی پہناتے ہیں

سیدانیاں جو خاک پہ بیٹھی ہیں سوگوار (۵) سانسوں میں سسکیاں ہیں تو آنکھیں ہیں اشکبار
چہروں پہ ہیں اداسیاں زلفوں میں انتشار سوئے نجف نگاہیں اُٹھاتی ہیں بار بار
کرب و بلا کا دشت ہے آفت لیے ہوئے
شامِ غریباں آئی قیامت لیے ہوئے

دل کی تڑپ کو اور جراحت کو کیا کہیں (۶) دُرّوں کی چوٹ اور اذّیت کو کیا کہیں
صدمے سے چیختی ہوئی فطرت کو کیا کہیں بیمارِ کربلا کی مصیبت کو کیا کہیں
سینہ کمر ہو ، پُشت ہو ، زخموں سے چور ہے
غش آرہا ہے شام کا دربار دور ہے

سر پر نہیں ہیں سیّدِ ابرار کیا کریں (۷) ناصر ہے کوئی اور نہ مددگار کیا کریں
لشکر ہے فوج ہے نہ علَم دار کیا کریں بہنوں کے نیلے ہوگئے رخسار کیا کریں
تنہا کھڑے ہیں ظلم و ستم کی فضاؤں میں
ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے تو بیڑی ہے پاؤں میں

غربت زدوں کی شام و سحر دیکھتے رہے (۸) نیزوں پہ سر کہ شمس و قمر دیکھتے رہے
سارے تماش بیں کی نظر دیکھتے رہے دیکھا نہ جارہا تھا مگر دیکھتے رہے
تھی سربرہنہ عترتِ اَطہار کیا کریں
وہ شام شام شام کا بازار کیا کریں

زینبؑ کی طرح جو تھے بہتّر کے سوگوار (۹) تھیں برچھیاں غموں کی کلیجے کے آرپار
آتا تھا غش پہ غش جنہیں راہوں میں بار بار تلووں میں جن کے ٹوٹے ہوئے تھے ہزار خار
اُمت کے ظلم و جوَر پہ کب بددعا کیے
کھا کھا کے تازیانے بھی شکر خدا کیے

القصّہ جب حرم گئے دربارِ شام میں (۱۰) سہتے ہوئے ستم گئے دربارِ شام میں
دل پہ لیے اَلم گئے دربارِ شام میں ہے ہے بچشمِ نم گئے دربارِ شام میں
دیکھا کہ جامِ مے ہے یدِ بدخصال میں
اور زیرِ تخت رکھا ہے سر شہؑ کا تھال میں

اللہ شہر بانوؑ کا اِکلوتا لالہ فام (۱۱) کمزور و ناتواں تھا مجبور و تشنہ کام
بیمارِ کربلا پہ تھا ہر امتحاں تمام تابوت ہاتھ پر کبھی تُربت کا اہتمام
زندان میں بھی تازہ مصیبت گزر گئی
گُھٹ گُھٹ کے یاد شہؑ میں سکینہؑ جو مر گئی

نجمیؔ جگر فگار کا کیا مرثیہ لکھوں (۱۲) بے یار و بے دیار کا کیا مرثیہ لکھوں
بیمار و غم گسار کا کیا مرثیہ لکھوں سجادؑ اشک زار کا کیا مرثیہ لکھوں
رومالِ زندگی کو بھگوئے ہیں رات دن
چالیس سال باپ کو روئے ہیں رات دن

مرثیہ

داغِ فرزند کا کس طرح اٹھائیں گے حسینؑ (۱) کتنا دل کتنا جگر اور دکھائیں گے حسینؑ
سوئے مقتل ابھی کیا اور بھی جائیں گے حسینؑ نوجواں لال کی میّت کو بھی لائیں گے حسینؑ
ہے کمر ٹوٹی ہوئی قوتِ بازو بھی نہیں
اتنا روئے ہیں کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

واسطہ دیتے ہیں اخلاق نبیؐ کا اکبرؑ (۲) واسطہ دیتے ہیں پیکار علیؑ کا اکبرؑ
واسطہ دیتے ہیں شبرؑ سے سخی کا اکبرؑ پاؤں کو چوم کے عباسؑ جری کا اکبرؑ
ہاں وہ مرنے کیلئے ضِد بخدا کرتے ہیں
باپ جن کیلئے جینے کی دعا کرتے ہیں
بولے شہؑ کس طرح میداں کی اجازت دیدیں (۳) برچھیوں کے لیے یہ چاند سی صورت دیدیں
ٹھوکریں کھانے کو آنکھوں کی بصارت دیدیں ہے بہن خیمے میں اور ہم تمھیں رُخصت دیدیں
کیسے جی پائیگی احمدؐ کی نواسی زینبؑ
غم سے مر جائیگی دیدار کی پیاسی زینبؑ
میری ہمشیر جو زہراؑ کی ہے جائی دلبر (۴) جان و دل سے وہ تمہاری ہے فدائی دلبر
اپنے سینے پہ سدا ، تم کو سلائی دلبر اس کی اٹھارہ برس کی ہو کمائی دلبر
لے کے شادی کی خوشی آئی جوانی بیٹا
سارے ارمانوں پہ تم پھیرو نہ پانی بیٹا
اُم لیلیٰؑ کو غش آتا ہے سنبھالو دلبر (۵) بڑھ کے تم اپنے کلیجے سے لگالو دلبر
غم میں ڈوبی ہے اُسے غم سے نکالو دلبر جتنی لے سکتے ہو تم اُتنی دعا لو دلبر
خالی جاتی ہی نہیں ہے دلِ مضطر کی دعا
ہر برے وقت میں کام آتی ہے مادر کی دعا
عشق ہے عابدِؑ بیمار کو اکبرؑ تم سے (۶) بیکس و مضطر و ناچار کو اکبرؑ تم سے
روزِ عاشور کے غم خوار کو اکبرؑ تم سے ہائے اک تشنۂ دیدار کو اکبرؑ تم سے
اپنے دل میں لیے بھائی کی محبت بیٹا
درِ خیمہ سے کھڑے تکتے ہیں صورت بیٹا
درد ہوتا ہے سوا دل میں ہمارے اکبرؑ (۷) آہ سب ٹوٹ گئے رن میں سہارے اکبرؑ
آسماں خالی ہوا چل دئے تارے اکبرؑ ہم بھی کچھ دم میں ہیں اب گور کنارے اکبرؑ
سہ نہ پائیں گے تمھاری یہ جدائی بیٹا
اب نہ بھانجے نہ بھتیجے ہیں نہ بھائی بیٹا
امتحاں تم تو نہ لو اپنے پدر کا بیٹا (۸) اس بُرے وقت میں زہراؑ کے قمر کا بیٹا
دھیان تم کو نہیں اس راہ گزر کا بیٹا داغ ہوتا ہے برا لختِ جگر کا بیٹا
روئے یعقوبؑ سفیدی سے بدل جاتا ہے
اور ایوبؑ سا صابر بھی دہل جاتا ہے
مرنا اولاد کا واللہ ، ستم ہوتا ہے (۹) جان و دل پر عجب اندوہ و اَلم ہوتا ہے
کانپ جاتا ہے جگر جس سے وہ غم ہوتا ہے زور بازو میں نہ کچھ سینے میں دم ہوتا ہے

کس طرح لاش اٹھائیں گے تمہاری اکبرؑ
جب یہ ہوگی درِ خیبر سے بھی بھاری اکبرؑ
پر مقدر کا لکھا کون بدل سکتا ہے (۱۰) نوجواں لال بھی ہاتھوں سے نکل سکتا ہے
گر کے ماں باپ کے قدموں پہ محل سکتا ہے عزم محکم ہو تو پھر کیسے وہ ٹل سکتا ہے
موت کی راہ سے نجمیؔ وہ گزر سکتا ہے
نُصرتِ دین میں سو جان سے مر سکتا ہے

مرثیہ

داغ فرزند کا دنیا میں بُرا ہوتا ہے
داغ فرزند کا دنیا میں برا ہوتا ہے (۱) یہ وہی غم ہے جو ہر غم سے سوا ہوتا ہے
ہوش کھو جاتے ہے اوسان خطا ہوتا ہے باپ کے واسطے پیغامِ قضا ہوتا ہے
ہم کو غربت میں نہ اسطرح سے مارو بیٹا
پہلے تم قبر میں بابا کو اُتارو بیٹا
یہ وہی غم ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے (۲) آنکھیں رو پڑتی ہیں طوفان اُٹھا جاتا ہے
کالے بادل کی طرح زیست پہ چھا جاتا ہے بجلیاں خرمنِ دل پر یہ گرا جاتا ہے
سارے ارمانوں پہ پھر جاتا ہے پانی بیٹا
جب لہو منہ سے، اُگلتی ہے جوانی بیٹا
دشتِ غربت میں نہ اسطرح سے چھوڑو بیٹا (۳) بھائی منہ موڑ چکا ، تم تو نہ موڑو بیٹا
دل بہت ٹوٹ چکا اور نہ توڑو بیٹا ٹکڑے ٹکڑے ہُوا جاتا ہوں میں جوڑو بیٹا
کیا تمہیں لگتا ہے اس چوٹ کو سہہ پاؤں گا
ایک شیشے کی طرح ٹوٹ کے رہ جاؤں گا
میں پیمبرؐ کا نواسہ ہوں پیمبرؐ تو نہیں (۴) اور توانائی میں حمزہؓ نہیں جعفرؓ تو نہیں
ایک کمزور سا انسان ہوں حیدرؑ تو نہیں موم سا دل ہے بھرے سینے میں پتّھر تو نہیں
صرف کچھ دیر میں دنیا سے گزر جاؤں گا
تم کو دیکھوں گا نہ اکبرؑ تو میں مر جاؤں گا
تم تو ہو قدرتِ داود کی نشانی اکبرؑ (۵) شکل و صورت سے ہو تم احمدؐ ثانی اکبرؑ
خون سے لال ہو پوشاک نہ دھانی اکبرؑ خاک میں اپنی ملاؤ نہ جوانی اکبرؑ
کتنے ارمانوں سے پالا ہے تمہیں زینب نے
جان سے بڑھ کے سنبھالا ہے تمھیں زینبؑ نے

رن میں جاؤ نہ قیامت کی تمنّا لے کر (۶) باپ کے عشق میں نصرت کی تمنّا لے کر
دل میں نیزے کی اذیت کی تمنّا لے کر بعدِ عباسؑ ، شہادت کی تمنّا لے کر
سَر کُھلے زینبِؑ دلگیر نکل جائے گی
سوئے مقتل میری ہمشیر نکل جائے گی

پہلے جاکر میری زینبؑ کو مناؤ اکبرؑ (۷) اپنی مادر کو بھی سینے سے لگاؤ اکبرؑ
پیار بہنوں کو کرو ناز اُٹھاؤ اکبرؑ پھر جو قسمت میں لکھا ہے وہ دکھاؤ اکبرؑ
الغرض جنگ میں تقدیرِ جواں پھوٹ گی
ایسا نیزہ لگا سینے میں اَنی ٹوٹ گی

شاہؑ چلائے کہ دل پھٹتا ہے گھبراتا ہے (۸) ٹھوکریں کھاتا ہے شبیرؑ جدھر جاتا ہے
یہ ستم اور بھی کچھ ہم پہ ستم ڈھاتا ہے کوئی اکبر تیرے پُرسے کو نہیں آتا ہے
تیرے مر جانے کا کہہ کہہ کے فسانہ اکبرؑ
ہائے ہم روتے ہیں ، ہنستا ہے زمانہ اکبرؑ

گو کہ جاں کھو چکے اے جانِ برادر آؤ (۹) نہر کو چھوڑ کے غازی و غضنفر آؤ
میرے حمزہؑ میرے جعفرؑ میرے حیدرؑ آؤ تم کو اَماں کی قسم دوشِ ہوا پر آؤ
لاش اکبرؑ نہیں اُٹھتی ہے اُٹھائے عباسؑ
ہاتھ ٹوٹے ہیں کمر ٹوٹی ہے ہائے عباسؑ

وہ مہہِ نَو گیا آنکھوں کا ستارہ بھی گیا (۱۰) جس پہ تکیہ تھا ، وہی دل کا سہارا بھی گیا
جاں سے پیارا تھا جو مجھ کو وہی پیارا بھی گیا وہ مِلا داغ کہ سب ضبط کا پارا بھی گیا
میرے مالک مجھے اب وہ بھی سعادت دےدے
سب تجھے دے چکا تومجھ کو شہادت دےدے

مرثیہ

جب عالمِ شباب میں اکبرؑ گزر گئے (۱) نیزہ ستم کا کھا کے کلیجے پہ مرگئے
کپڑے تمام خاک میں اور خون میں بھر گئے نوحہ کیا حسینؑ نے دلبر کدھر گئے
پائے تھے سب صفات جدِ خوش خصال کے
اکبرؑ ابھی ہوئے تھے تم اٹھارہ سال کے

خوشیاں منارہے ہیں ستمگر کہاں ہو تم (۲) چمکا رہے ہیں نیزہ و خنجر کہاں ہو تم
کس جا ہو ہم شبیہ پیمبرؐ کہاں ہو تم کچھ تو صدائیں دو علی اکبرؑ کہاں ہو تم
پیری میں تم بچھڑگئے قسمت کی بات ہے
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے

کس طرح آئے لاش پہ بوڑھا پدر بتاؤ (۳) پیٹے دلِ حزیں کو کہ پیٹے جگر بتاؤ
پہلے ہی ہو چکی ہے خمیدہ کمر بتاؤ کس بدنظر کی کھا گئی تم کو نظر بتاؤ
مادر تمہاری روتی ہے کھوتی ہے جاں کہو
آئی بھری بہار میں کیسی خزاں کہو
آئی صدا جو کانوں میں بابا سلام لو (۴) زخموں سے چُور چُور پسر کا پیام لو
آئی بوقتِ ظہر جوانی کی شام لو اللہ صبر و ضبط سے ہمت سے کام لو
افسوس بیکسی میں تمھیں چھوڑتے ہیں ہم
حافظ خدا تمہارا کہ دم توڑتے ہیں ہم
مقتل میں پہنچے ٹھوکریں کھاتے شہِؑ اُمم (۵) دیکھا چھِا ہے سینے میں اک نیزۂ ستم
منہ سے لہو اگلتے ہیں اور رک رہا ہے دم سر پیٹ کر گرے سرِ بالیں بصد الم
بولے حسینؑ خیر سے ہو یا گزر گئے
اے لال تم سے پہلے ہی ہم کیوں نہ مرگئے
یوسفؑ سا لو حُسین پسر ہم سے چھٹ گیا (۶) دن ہے سیاہ نورِ نظر ہم سے چھٹ گیا
پھٹتا ہے دل کہ لختِ جگر ہم سے چھٹ گیا روشن تھا جس سے گھر وہ قمر ہم سے چھٹ گیا
سب زور ختم ہوگیا طاقت چلی گئی
یعقوبؑ کی طرح سے بصارت چلی گئی
اک روز میں یہ کیسا بھرا گھر اُجڑ گیا (۷) بس دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ ، بگڑ گیا
نیزہ ستم کا چاند سے سینے میں گڑ گیا اللہ اے کیسا تفرقہ قسمت سے پڑگیا
غربت میں یوں جوان پسر چھوٹ جائیگا
پیری کا جو عصا تھا وہی ٹوٹ جائیگا
شبیرؑ دل کو تھام کے کرنے لگے فغاں (۸) کھینچی پسر کے سینے سے اللہ اے سناں
ہل چل ہوئی زمیں کو لرز اُٹھّا آسماں پوری طرح اُٹھا نہ سکے لاشۂ جواں
صبر و رضا کے زینے پہ خط کھینچتے رہے
پاؤں زمیں کے سینے پہ خط کھینچتے رہے
مرنا جواں پسر کا عجب دن دکھا گیا (۹) چشمِ پدر کو خون کے آنسو رلا گیا
اہلِ حرم میں اک صفِ ماتم بچھا گیا اللہ رے خیمہ گاہ میں محشر اُٹھا گیا
سرورؑ سے ہم شبیہِ پیمبرؐ بچھڑ گیا
دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اکبرؑ بچھڑ گیا

جینے کا لطف جا چکا اکبرؑ تمہارے بعد (۱۰) نظروں میں اب ہے موت کا منظر تمہارے بعد
چلتے ہیں چار سمت سے پتھر تمہارے بعد نزدیک تر گلے سے ہے خنجر تمہارے بعد
جلدی تھی کیسی خُلد کی راحت میں جا بسے
جنگل میں ہم کو چھوڑ کے جنت میں جا بسے

مرثیہ

قبرِ نبیؐ سے چھٹتا ہے سلطانِ کربلا (۱) پیشِ نظر ہے نقشۂ میدانِ کربلا
آمادۂ سفر ہے سلیمانِ کربلا آواز دے رہا ہے بیابانِ کربلا
غربت کی راہ میں ہے سفینہ حسینؑ کا
اب کربلا بنے گی ، مدینہ حسینؑ کا

روزِ ازل سے وقف ہے شبیرؑ کے لیے (۲) واللہ مقصدِ شہِؑ دل گیر کے لیے
خوابِ دلِ خلیلؑ کی تعبیر کے لیے مقتولِ خنجر و تبر و تیر کے لیے
اس پر بہے گا خون پسینہ حسینؑ کا
ڈوبے گا خشکیوں میں سفینہ حسینؑ کا

جاتا ہے کربلا کو نواسہ رسولؐ کا (۳) ہمراہ سب لیے ہوئے کنبہ رسولؐ کا
زیرِ لحد بلند ہے گریہ رسولؐ کا ہے چاک چاک غم سے کلیجہ رسولؐ کا
مرسلؑ ہیں بے قرار فراقِ حسینؑ میں
آنکھیں ہیں اشک بار فراقِ حسینؑ میں

شبیرؑ کی نظر کا نظارہ ہے کربلا (۴) فرشِ زمیں پہ عرش کا تارہ ہے کربلا
کعبہ بھی کہہ رہا ہے دل آرا ہے کربلا طوفانِ تشنگی کا کنارا ہے کربلا
وہ تشنگی کہ دیکھ کے روئے فرات بھی
منہ اپنا سیلِ اشک سے دھوئے فرات بھی

پیاسا ہے آہ شافعِ محشر کا لاڈلا (۵) کرب و بلا میں بنتِ پیمبرؐ کا لاڈلا
سردارِ خلد ساقیِ کوثر کا لاڈلا کعبے سے دور حیدرِؑ صفدر کا لاڈلا
بجھ جائے جس سے تشنہ دہانی نہیں ملا
دن تیسرا ہے شاہؑ کو پانی نہیں ملا

شانے کٹا کے شیرِ غضنفر گزر گیا (۶) نیزہ لگا کلیجے پہ اکبرؑ گزر گیا
پامال ہو کے قاسمؑ مضطر گزر گیا اصغرؑ بھی تیر کھا کے گلے پر گزر گیا
نقشہ ہی سب بگڑ گیا زینبؑ کے سامنے
زہراؑ کا گھر اُجڑ گیا زینبؑ کے سامنے

گھیرے ہیں چار سمت سے اعدا حسینؑ کو (۷) تیغیں لگاتے ہیں کبھی نیزا حسینؑ کو
ہنگامِ عصر دیکھ کے تنہا حسینؑ کو سجدے میں قتل کر دیا پیاسا حسینؑ کو
حلاّلِ مشکلات خدا کے ولی مدد
زینب پُکارتی ہی رہی یا علیؑ مدد

لو شاہِؐ مشرقین سے زینبؑ بچھڑ گئی (۸) زہراؑ کے نورِ عین سے زینبؑ بچھڑ گئی
یثرب کی زیب و زین سے زینبؑ بچھڑ گئی پردیس میں حسینؑ سے زینبؑ بچھڑ گئی
غم کھائیگی ، تو اشک مسلسل پیے گی آہ
زینبؑ بغیر بھائی کے کیسے جیے گی آہ

خورشید کو گہن جو لگا ہوش کھوگئے (۹) مقتل میں شورِ حشر اُٹھا ہوش کھوگئے
آبِ فرات اونچا ہوا ہوش کھوگئے سُنتے ہی اُقتُلو کی صدا ہوش کھوگئے
دیکھا کہ مصطفیٰؐ کے نواسے حسینؑ کا
نیزے پہ سر بلند ہے پیاسے حسینؑ کا

نورِ نگاہِ رحمتِ عالم سلام لے (۱۰) انسانیت کے شاہِؑ مکرم سلام لے
ہر آنکھ تیرے غم میں ہے پرنم سلام لے لے اے شہیدِ ماہِ محرم سلام لے
دن رات مجلسوں کا یہ ہدیہ قبول کر
اہلِ عزا کا ماتم و نوحہ قبول کر

نجمیؔ قلم کو روک کہ مضموں ہوا تمام (۱۱) محوِ فغاں ہیں بزم میں مولا کے سب غلام
ہو مرثیہ نگاری میں تیرا بھی اُونچا نام توفیقِ فکر اور دے وہ تیسرا امامؑ
مجلس میں تجھ کو آلِ پیمبرؐ دعائیں دیں
بیٹی علیؑ کی زینبِؑ مضطر دعائیں دیں

مرثیہ

کرتا ہوں نقل راویِ مقتل کا میں بیان (۱) جسکے مشاہدے میں تھا پُر درد یہ سماں
سکتے میں تھے زمین تو گُم سُم تھا آسماں دستِ حسینؑ کی وہ بلندی پہ بے زباں
دیکھی جو لب پہ پیاس کی بیدار رو پڑے
فوجِ لعین میں صاحبِ اولاد رو پڑے

چلّا کے حُرملہ سے عمر نے کیا کلام (۲) شہؑ کے سوالِ آب کو کردے یہیں تمام
تشنہ لبی کی تیغ نہ کر جائے قتل عام بَرہم سا ہوگیا ہے میری فوج کا نظام
ایسا نہ ہو کہ بات بگڑ جائے حُرملہ
آپس میں اختلاف نہ پڑجائے حُرملہ

جلدی کماں سے تیر رہا کر نہ دیر ہو (۳) ہرگز نہ جامِ آب سے بے شِیر سیر ہو
اس کمسنی میں بھی نہ جری ہو دلیر ہو عباسؑ کی طرح نہ بھتیجا بھی شیر ہو
بس قتل کر کے دم لے یہیں پر صغیر کو
مُنہ سے اُگل دے خون کے ہمراہ شیر کو

اس کو ہوائے تیر سُلا دے تو بات ہے (۴) چشمِ پدر کو خون رُلا دے تو بات ہے
اک حشر قبلِ حشر اُٹھا دے تو بات ہے کُہرام بیبیوں میں مچا دے تو بات ہے
رن میں بجھا دے بانوئے دل گیر کا چراغ
گھر تک نہ جائے لوٹ کے شبیرؑ کا چراغ

پھر حرملہ کے تیر سے آخر غضب ہوا (۵) سیدھا گلوئے اصغرِؑ ناداں پہ جالگا
مشکیزہِ سکینہؑ بھی یونہی ہدف بنا پانی کے ساتھ خونِ جری بھی بہا کیا
غازی کا ہاتھ ایک کے بعد اک قلم ہوا
گِر کر زمینِ گرم پہ ٹھنڈا علم ہوا

یہ ظلمِ حُرملہ تھا ہر اک ظلم سے بڑا (۶) پہلو بدل کے رہ گیا بانوؑ کا لاڈلا
آنکھوں میں شاہِؑ دیں کی اندھیرا سا چھا گیا فرمایا رو کے کر میری امداد یا خدا
ناوک گلے سے کھینچا جو ماہِ مُنیر کے
اصغرؑ کی جاں نکل گئی ہمراہ تیر کے

شہؑ بولے ظالموں سے لو میں صبر کر گیا (۷) مَل کر لہو صغیر کا رُخ پر نکھر گیا
حجّت تمام کرنا تھی مجھ کو سو کر گیا اصغرؑ بھی میرے ہاتھ پہ پیاسا ہی مر گیا
راس آئیں گی نہ سختیاں روزِ جزا تمھیں
دربارِ ایزدی سے ملے گی سزا تمھیں

پس سوئے خیمہ گاہ چلے شاہِؑ نام دار (۸) رُخ پر پڑا ہوا تھا غم و رنج کا غبار
آگے بڑھے کبھی ہٹے پیچھے کو سات بار کیا بانوئےؑ حزیں سے تھے شبیرؑ شرمسار
ایوبؑ بھی خاموش تھے کچھ ایسا حال تھا
مجروح دل تھا ، اور جگر پائمال تھا

ناگاہ پشتِ خیمہ پہ آئے باحالِ زار (۹) جلتی زمیں پہ بیٹھ گئے شاہِؑ ذی وقار
اللہ رے ذوالفقار کو لا کر بَرُوَے کار تادیر کھودتے ہی رہے قبرِ شیرِ خوار
آنکھوں سے سب بہا دیا اشکِ ملال کو
زیرِ لحد چھپا دیا بانوؑ کے لال کو

ہنگام عصر آگیا حضرتؑ سے جب قریب (۱۰) طاری ہوئی امامؑ پہ اک کیفیت عجیب
فرمایا آرہا ہوں تیری سَمت یا مجیب پاؤں اگر شہادتِ عظمیٰ مرا نصیب
لَو دل کی لگ گئی تھی جو ربّ قدیر سے
بس پڑھ کے فاتحہ اُٹھے قبرِ صغیر سے

مرثیہ

کیسے شہادتِ علی اصغرؑ رقم کروں (۱) کیسے سوالِ آب کا منظر رقم کروں
وہ دھوپ اور وہ ریت کا بستر قم کروں سوکھا گلا وہ تیرِ ستم گر رقم کروں
کیسے پدر کے ہاتھ پہ بے روح و جاں ہوا
انسانیت کی آنکھ سے آنسو رواں ہوا

ناوک جو اپنے قد میں تھا بے شِیر سے بڑا (۲) گردن چھِی تو باپ کا بازو بھی چھد گیا
مجروح قلبِ بانوئےؑ ناشاد بھی ہوا اصغرؑ لہو میں ڈوب کے دنیا سے چل بسا
ماہر ستم کے ڈھانے میں کیا کیا لعین تھے
سہ شعبہ تیر تھا تو نشانے بھی تین تھے

اصغرؑ کی موت سے تہہ و بالا تھی کربلا (۳) خیمے سے آرہی تھی کسی ماں کی یہ صدا
اے تیرِ حرملہ میرا بچہ تھا پھول سا پیاسا تھا تین روز سے آبِ فرات کا
غربت میں میری ساری بضاعت ہی لُٹ گئی
ہے ہے میں اپنے ہنسلیوں والے سے چھُٹ گئی

سُن کر صدائے بانوئےؑ دلگیر کیا کرے (۴) اے کربلا بتا تو ہی شبیرؑ کیا کرے
سہہ سہہ کے ظلم صبر کی تصویر کیا کرے ہر سمت ہے کھنچی ہوئی شمشیر کیا کرے
کھا کر گلے پہ تیر کو خاموش ہوگیا
بے شِیر جان دے کے سبکدوش ہوگیا

سہنا تھی جتنی زخم کی تکلیف سہ گیا (۵) منہ کو غریب باپ کے تکتا ہی رہ گیا
کہنا تھا جو بھی صرف تبّسم سے کہہ گیا جتنا لہو تھا جسم میں سب منہ سے بہہ گیا
چُلو میں بھر کے خون کو اب کیا کرے حسینؑ
ڈھاتے ہیں سب غضب پہ غضب کیا کرے حسینؑ

چاہا فلک پہ پھینک دیں دلبر کے خون کو (۶) نورِ نگاہِ بانوئےؑ مضطر کے خون کو
یعنی شہیدِ تیرِ ستم گر کے خون کو قوت سمیٹ کر علی اصغرؑ کے خون کو
آئی ندا کہ ناز تھا اس نازنین پر
برسے گا ایک بوند نہ پانی زمین پر

پھر چاہا پھینک دیں طرفِ خاکِ کربلا (۷) پاکیزہ خون گلشنِ زہرؑا کے پھول کا
جو رن میں قتل ہو گیا بے جرم و بے خطا شبیرؑ کو جو سب سے بڑا داغ دے گیا
آئی ندا ، یہ خون کا ہوگا عجب اثر
دانہ کوئی اُگے گا نہ روئے زمین پر

کتنا گراں لہو تھا وہ پیاسے صغیر کا (۸) ارض و سما نے لینے سے انکار کر دیا
شہؑ نے پھر ایک بار کیا شکرِ کبریا واللہ اپنے چہرہ گُل گوں پہ مَل لیا
بولے یونہی ملوں گا رسولِ کریمؐ سے
اُمّت کو بخشواؤں گا ربِ عظیم سے

بیشک وہ علم و فضل کی دولت کہاں نصیب (۹) شیرینیِ زبان و فصاحت کہاں نصیب
افکار میں وہ خوبی و ندرت کہاں نصیب وہ دل ، دماغ اور وہ طبیعت کہاں نصیب
بے شیر پہ، پڑی جو مصیبت نہ لکھ سکے
نجمیؔ ، انیسؔ جیسی شہادت نہ لکھ سکے

مرثیہ

شہؑ سے نمازِ عصر کی ساعت قریب ہے (۱) تیغوں سے بوسہ گاہِ رسالتؐ قریب ہے
مقتل میں جو اُٹھے گی قیادت قریب ہے مظلومِ کربلا کی شہادت قریب ہے
حیدرؑ کے نورِ عین کا زہرؑا کے چین کا
گونجے گا کائنات میں ماتم حسینؑ کا

سیدانیوں میں حشر سا برپا ہے مومنو (۲) کتنا حسینؑ آج اکیلا ہے مومنو
فضّہ سے رَختِ کُہنہ جو مانگا ہے مومنو بے حال غم سے زینبِؑ کُبریٰ ہے مومنو
بھائی بہن کے دل نہ سنبھالے سنبھلتے ہیں
اک ساتھ جیسے دو دو جنازے نکلتے ہیں

لکّھا ہے رُخصتِ شہِؑ ولا کے باب میں (۳) زہرؑا کی لاڈلی تھی عجب اِضطراب میں
کشتی آلؑ ڈوب رہی تھی سُراب میں عباسؑ بن کے عشقِ بنِ بوترابؑ میں
پشتِ فرس پہ بڑھ کے شہہِؑ مشرقین کو
زینبؑ نے خود سوار کیا تھا حسینؑ کو

پائے فرس سے لپٹی تھی اک بچی خورد سال (۴) گلزار رنگ و بو میں تھی پھولوں سے خوش جمال
آلودہ خاکِ کرب و بلا میں تھے سر کے بال کہتی تھی میرا غم سے کلیجہ ہے پائمال
عمّو کی طرح دے کے دلاسہ نہ جایئے
بابا نہ جایئے مرے بابا نہ جایئے

بولے اُتر کے گھوڑے سے پھر شاہِؑ نامدار (۵) تم ہو مری نمازِ تہجد کی یادگار
سہنی ہے سختیاں تمہیں اے میری گُل عزار تم امتحانِ تشنہ لبی دوگی بار بار
بیٹی تمہارے ظرف کو یہ آزمائیں گے
اعدا نظر کے سامنے پانی بہائیں گے

نالوں سے کربلا کی زمیں کو ہِلا چکیں (۶) زینبؑ کی طرح اشک مسلسل بہا چکیں
عباسِؑ باوفا کا بھی صدمہ اُٹھا چکیں اللہ یتیموں سی صورت بنا چکیں
دل پر چُھری سی چلتی ہے رنج و ملال کی
بالی سکینہؑ تم ہو ابھی چار سال کی

لو جاتے جاتے سینے پہ اپنے سلا چکے (۷) جتنا بھی ناز اُٹھانا تھا بیٹی اُٹھا چکے
ساری کمائی خاک میں اپنی ملا چکے تم کو مقامِ شکر میں زینبؑ بنا چکے
ٹکرا کے تم سے سیف و قلم ٹوٹ جائیں گے
سارے جہاں کے ظلم و ستم ٹوٹ جائیں گے

بیٹی رضا دو خالقِ اکبرؑ کے واسطے (۸) لشکر ہے جمع ، سبطِ پیمبرؐ کے واسطے
تیغیں کھینچی ہیں بے کس و مضطر کے واسطے سوکھا گلا ہے ، شمر کے خنجر کے واسطے
دل کو ملے گی باپ کے تسکین لاڈلی
جب تم پڑھو گی سورۂ یٰسین لاڈلی

ظالم ہیں اپنے ظلم سے کب باز آئیں گے (۹) گھوڑوں کی نعل بندی کا جب حکم پائیں گے
مقتل میں میرے جسم کے ٹکڑے اڑائیں گے نیزے پہ سر اُٹھائیں گے خوشیاں منائیں گے
رَن کی زمین خون سے مرے لال ہوئے گی
لاشِ حسینؑ گھوڑوں سے پامال ہوئے گی

❁❁❁

جموں وکشمیر میں معاصر رثائی شاعری

نثار احمد (ریسرچ اسکالر جامعہ کشمیر)

اردو شاعری کے عظیم سرمائے میں رثائی شاعری کو بڑی اہمیت اور انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس میں زندگی کی اعلیٰ اور سچی قدریں پیش کی جاتی ہیں۔اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی زندگی اس کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہی ہوتی ہے۔ جب آدمؑ کے بیٹے قابیل نے ہابیل کا قتل کیا تو آدمؑ نے اس کی میت پر آنسو بہائے اور موزوں الفاظ میں نالہ فریاد کیے۔ یہ سلسلہ انبیائے کرامؑ میں بھی چلتا رہا جنابِ یعقوبؑ نے بھی اپنے فرزند حضرتِ یوسفؑ کے فراق میں اتنی اشک ریزی کی کہ چشمانِ مبارک سفید ہوگئیں۔ جب معرکہ کربلا وقوع پزیر ہوا تو یہ صنف ماننے کہ اسے معرکے کے نام ہوگئی۔عربی و فارسی شعراء نے اپنے کلام میں اس فقید المثال معرکے کا ذکر اپنی منظومات میں مختلف طریقوں سے کیا جس کا تذکرہ اس مضمون میں طوالت کا باعث بن سکتا ہے اسی لیے راقم السطور ان سے صرفِ نظر کر کے آگے بڑنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس میں بھی واقعہ کربلا کو شعراء نے مختلف اصناف میں بیان کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے جیسے مرثیہ، سلام، نوحہ، سوز، زاری وغیرہ اصنافِ کامل کے طور پر واقعہ کربلا سے مختص ہوچکی ہے۔ان اصناف کی تجسیم وتخلیق اور تصور کربلا کے بغیر ناممکن تھی لہٰذا اردو شاعری میں ان تینوں اصنافِ مرثیہ، سلام اور نوحہ کو معرکہ کربلا کے بعد بطورِ صنف ایک اہم مقام حاصل ہوا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کربلا نے اردو شعروادب کو متعدد اصناف سے مالا مال کیا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر سید عباس رضا یوں رقمطراز ہیں۔

> ''اردو شعروادب میں ایسے اصناف کی کثرت ہے جن میں مذہب واخلاق اور معتقدات اپنے جملہ اوصاف کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔تاہم یہ معتقدات بھر پور طریقے سے جن اصناف میں ظاہر ہوئے، ان میں مرثیہ، سلام اور نوحے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔اردو کے بہترین مورخین ناقدین اور محققین اس امر پر متفق ہیں کہ درجہ بالا اصناف نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، اعتبار، تنوع اور وقار بخشا ہے۔ان اصناف نے تہذیبی اور معاشرتی روایتوں ادبی تقاضوں اور معتقدات کی گود میں پرورش پا کر زندگی کی حقیقتوں کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا اور افراد کے باہمی رشتوں، روحانی قدروں اور فن کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھ کر حیات وکائنات کے بہت سے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا'' [1]

مرثیے کربلا سے پہلے بھی لکھے جاتے تھے لیکن واقعہ کربلا کے بعد مرثیہ اصطلاحی معنی میں شہادتِ امام حسینؑ اور انکے اصحاب کے لیے مخصوص ہوگیا ہے۔اسی طرح نوحہ بھی ایک ایسی صنف شاعری جس میں امام حسینؑ یا شہدائے کربلا کے مصائب نظم کیے جاتے ہیں۔اور پورا

نوحہ کسی ایک ہی شہید کے حال میں ہواور کسی ایک کی زبانی ہو۔اگر چہ اردو میں رثائی شاعری کا آغاز دیگر اصناف کی طرح دکن سے ہوا تھا لیکن بعد میں یہ دکن تک ہی محدود نہیں رہا ہے۔بلکہ شمالی ہند، گجرات، بنگال، پنجاب اور کشمیر غرض ہر جگہیں اور ہر علاقے میں اس کے نمونے اور روایت ملتی ہے جموں وکشمیر میں بھی اس کے نقوش اُسی زمانے سے ملتے ہیں جب سے یہاں اردو شعر وادب پہنچنے لگا۔چوں کہ یہاں ابتدا میں شاعروں کا زیادہ رجحان نظم، غزل، رباعی وغیرہ اصناف کی طرف رہا۔اس لیے ابتدا میں یہاں رثائی شاعری کے کم نمونے ملتے ہے۔تاہم اسی زمانے میں یہاں کی مقامی زبان یعنی کشمیری زبان میں رثائی شاعری خاص کر مرثیے نے جوترقی کی اس سے مرثیے کا بہت بڑا ادبی سرمایہ وجود میں آیا ہے۔یہ اس لیے ہوا کیونکہ اس وقت یہاں کے لوگوں کا زیادہ رجحان کشمیری اور فارسی زبان کی اور تھا۔جس کی مثال خود کشمیری مرثیہ ہے۔اس سلسلے میں جن مصنّفین حضرات کے نام قابل ذکر ہیں ان میں خواجہ حسین میر، خواجہ مرزا ابوالقاسم، خواجہ دائم، حکیم حسن علی، منشی صفدر علی، حکیم حبیب اللہ، خواجہ محمد باقر، حکیم محمد عظیم، حکیم عبداللہ، حکیم غلام رسول، منشی محمد یوسف وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان مصنّفین نے مرثیے پر طبع آزمائی کر کے اس کو اردو مرثیہ کے ہم پلہ کیا ہے۔بعد میں جب یہاں کے اردو شعراء حضرات نے اس صنف پر خامہ فرسائی کرنی شروع کر دی تو ان میں زیادہ شعراء حضرات نے شخصی مرثیے لکھے۔ان شعراء حضرات میں شبیر علی خان بسمل، قاضی عبداللہ خان منظور، منشی امیر الدین امیر، منشی صادق علی، خوشی محمد ناظر، نند لال کول، طالب کاشمیری اور دیا ناتھ رفیق قابل ذکر ہیں۔بیسویں صدی کے جن شعراء حضرات نے رثائی ادب کی بھر پور خدمات انجام دی ان میں تنہا انصاری ایک اہم نام ہے۔تنہا انصاری نے کشمیر میں رثائی شاعری کی بھر پور خدمت کی ہے۔پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کلاسیکی انداز کے مرثیوں میں شاید کشمیر کے وہ واحد سربلند شاعر مانے جاتے ہیں''

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ راقم کو تنہا انصاری صاحب کے مرثیے، نوحے اور سلام بسیار تلاش کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوئے البتہ موصوف کا ایک سلام جو حال ہی میں ایک اخبار میں شائع ہوا ہے نمونے کے بطور یہاں پیش کیا جاتا ہے

سلام اُس پر کہ جس کو فخرِ موجودات کہتے ہیں ۔۔۔ وہ جس کی بات کو ربِ علیٰ کی بات کہتے ہیں
سلام اُس پر جو عینِ نُور تھا نورِ مجسم تھا ۔۔۔ سلام اُس پر کہ سورج کی طرح جس کا نہ تھا سایا
سلام اُس پر مٹایا شرک اور الحاد کو جس نے ۔۔۔ سلام اُس پر مٹایا جور استبداد کو جس نے
سلام اُس پر دلوں کو جس نے ایمان کی ضیا بخشی ۔۔۔ وہ جس نے چاند کو سورج کو تاروں کو ضیا بخشی
سلام اُس پر دِیا دُنیا کو جس نے دینِ آفاقی ۔۔۔ غلامی سے ملی جس کے طفیل انساں کو آزادی
سلام اُس پر کہ مٹایا فرقِ نسل و رنگ کو جس نے ۔۔۔ اخُوت میں بدل ڈالا جنونِ جنگ کو جس نے
اسلام اُس پر بدل دی جس نے تقدیرابنِ آدمؑ کی ۔۔۔ سلام اُس پر کہ چرواہوں کو جس نے سلطنت بخشی

تنہا انصاری کے معاصرین میں سید اکبر ہاشمی، حکیم جلال الدین غازی، شمیم، نشاط انصاری، منظور ہاشمی اور اکبر جے پوری کا نام قابل ذکر ہے۔اول الذّکر شعراء کا اگر چہ زیادہ تر رجحان نظموں اور غزلوں کی طرف ہی رہا، لیکن اکبر جے پوری رثائی شاعری کی آبیاری کے سبب اپنے

معاصرین میں درخشاں ستارے کے مانند نمودار ہوئے۔ان کے نوحے اور سلام آج بھی محرم کے ایاّم میں عزادار ماتمی دستوں میں پڑھتے ہیں۔
شہزادی کلثوم جو کہ اکبر جے پوری کی ہمشیرہ ہیں کشمیر کی پہلی اور واحد شاعرہ ہیں جنہوں نے رثائی شاعری تخلیق کی ہے۔کلثوم کا کلام یادگارِ کلثوم کے نام سے ۱۹۶۳ء میں اکبر جے پوری صاحب نے مرتب کر کے شائع کرایا تھا۔اس مجموعے میں شہزادی کلثوم کی غزلیں، سلام اور نوحے موجود ہیں۔ان کے مزکورہ کلام کے مطالعہ سے کلثوم کے مذہبی جوش و خروش اور اہلبیت علیہ السلام سے انکی غیر معمولی عقیدت اور مودّت کا اظہار ہوتا ہے۔بقول بلقیس زیدی:

''غزل کے علاوہ کلثوم نے کچھ سلام اور مرثیے بھی لکھے ہیں جو بہ اعتبارِ شاعری ایک بلند درجہ رکھتے ہیں اور جن میں کلثوم کی عقیدت اور رغبت کی جھلک بہت نمایاں ہے۔فنی لحاظ سے بھی کلثوم کی شاعری کا یہ حصہ قابل داد ہے۔تخیل کی بلندی، احساس کی پاکیزگی، شوکت الفاظ اور الفاظ کی خوب صورت نشست، کلثوم کی فنی صلاحیتوں کا ایک روشن ثبوت ہیں۔مرثیہ یا سلام لکھنا اردو شاعری کی ایک مشکل صنف ہے اور میں پورے وثوق سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ کلثوم نے اس مشکل صنف میں بھی اپنے رمزِ طبیعت کا رنگ دکھایا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے اس سنگلاخ راہ کو بھی سہل و آسان بنادیا ہے۔''

پیش خدمت ہے ان کے ایک سلام اور ایک نوحے سے منتخب شدہ چند اشعار۔

نوحہ سے منتخب اشعار

یہی کہتی تھی زہراؑ کر کے بُکا   مرا باغ عدو نے اجاڑ دِیا
ہوئی مجھ پہ کیسی یہ ہائے جفا   مرا باغ عدو نے اجاڑ دِیا
جسے ناز و نعم سے پالا تھا   اُسی نورِ نظر کا واویلا!
گھوڑوں سے بدن پامال کیا   مرا باغ عدو نے اجاڑ دِیا

سلام سے منتخب شدہ چند اشعار

فردوس تشنہ جن کے ہے دیدار کے لیے   وہ پھول چاہئیں گل و گلزار کے لیے
ہونے کو یوں کلیمؑ بھی عیسیٰؑ بھی ہیں مگر   بخشش کا تاج ہے میرے سرکارؑ کے لیے
کعبہ ہے، کربلا ہے، مدینہ ہے، طوس ہے   کیا کیا علاقے ہیں تری سرکار کے لیے
پابند کیوں یزید ہو صوم وصلوٰۃ کا   طاعت نہ جب کہ فرض ہے میخوار کے لیے

بیسویں صدی کے آخری نصف میں جموں و کشمیر میں جن شعراء کے نام رثائی شاعری کے اُفق پر نمودار ہوئے ان میں سجود سیلانی، حکیم منظور، سید رضا اور فارق بڈگامی منفرد مقام کے حامل ہیں۔سجود سیلانی کے مراثی ''رسالہ سفینہ'' اور ''رسالہ الارشاد'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔مراثی کے علاوہ انھوں نے سلام، نوحے اور منقبت بھی لکھے ہیں۔ان کے ایک نوحے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مارے گئے شاہِ زمن بنتِ نبیؐ کے گلبدن
وہ راکبِ دوشِ نبیؐ وہ قرّۃ العینِ علیؑ
وہ حامی قرآن تھے وہ صاحب ایمان تھے
وہ رہ گئے تشنہ دہن

حکیم منظور کی شاعری میں کربلا ایک اہم موضوع رہا ہے انہوں نے اپنے سلام اور رثائی نظموں میں اس موضوع کو نہایت ہی سلیقے سے برتا ہے۔موصوف نے اپنا پہلا سلام ۱۹۶۴ء میں ایک حسینیؑ مشاعرے میں پڑا تھا۔پیش خدمت ہیں اس سلام کے چند اشعار

اہل حق، باطل کے آگے جھک نہیں سکتے کبھی ایک پہلو یہ بھی ہے اسلام کی تصویر کا
دین حق کو ختم کرنا تو فقط اک خواب تھا ظالموں کو کچھ پتا شاید نہ تھا تعبیر کا
ظلم و استبداد سے حق دب نہیں سکتا کبھی
ہے ازل سے فیصلہ یہ قاضیِ تقدیر کا

کربلا میں امام حسینؑ کے چھ مہینے کے فرزند علی اصغرؑ پیاس کی شدت سے العطش العطش کرتے رہے لیکن فوجِ اشقیا نے انہیں پانی کے بدلے تیر مار کر شہید کر دیا۔حکیم منظور نے اس کمسن معصوم شیر خوار کی تشنہ لبی کو جس انداز سے اپنے سلام میں پیش کیا ہے اسے پڑھ کر ہر رقیق القلب انسان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں۔دیکھیے شاعر نے کس فنکارانہ انداز سے اس واقعے کی عکاسی کی ہے۔

جب تشنہ لب تھا ساقیِ کوثر کا جاں نشین چھالے نہ کیوں پڑے ہوں دِلِ آفتاب میں
رک کیوں نہ گئی گردِشِ لیل و نہار حیف پانی کے بدلے تیر ملا جب جواب میں

رثائی شاعری کے باب میں پروفیسر سید محمد رضا کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے موصوف نے سلام کے ساتھ ساتھ کچھ نوحے بھی لکھے ہیں۔سید رضا صاحب کے لکھے ایک سلام کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

یہ جو سب حسن و ہنر حرف و نوا رکھتے ہیں ہم
اے شہیدِ کربلا تیری عطا رکھتے ہیں ہم

انسانی تاریخ میں امام حسینؑ کی المناک شہادت سے پوری عالم انسانیت متاثر ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کے مختلف مذاہب، مسالک، اقوام اور طبقات کے افراد امام عالی مقامؑ کی اس عظیم شہادت کو اپنے اپنے طریقے سے یاد کر کے انسانیت کے تئیں اپنی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔مرحوم ڈاکٹر عظیم امروہوی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''اردو زبان میں اس (یعنی رثائی ادب) کی تخلیق ہر علاقے ہر خطے ہر فرقے میں ہر قوم و مذہب کے لوگوں کے ذریعے ہوئی ہے''

سرزمینِ جموں و کشمیر میں جہاں مسلم شعراء نے رثائی شاعری کا بھرپور حق ادا کیا ہے وہیں غیر مسلم دانشوروں اور شعراء نے بھی امام عالی مقامؑ کی عظیم شہادت کو رثائی نظموں، نوحے اور سلام کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں یاد کر کے عقیدت کے پھول بارگاہِ حسینیؑ میں نچھاور کیے

ہیں۔ان شعراء نے امامؑ کی قربانی کو دینِ اسلام اور عالمِ انسانیت کی بقا کے لیے اہم ترین منزل قرار دیا ہے اور اپنی جدّت طبع سے امام حسینؑ کی شانِ اقدس میں ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں جن کا مطالعہ انسان کے ہر درد مند دل رکھنے والے انسان کو مضطرب و بے چین کر دیتا ہے اور ساتھ ہی باطل سے بیزاری کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔ مذکورہ غیر مسلم شعراء کی تعداد بھی کافی ہیں جن میں عرش صہبائی، جگدیش راج دل کاشمیری، پرفیسر رام ناتھ شاستری، عابد مناوری، سردار جگناتھ دلگیر، سردار اوتار سنگھ چندن اور پرتپال سنگھ بیتاب وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم وقت کی تنگ دامانی کے باعث ان سارے شعراء کے کلام کے نمونوں کو یہاں پیش کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔اس لیے میں اختصاراً چند شعراء کے نمونہ کلام کو پیش کر رہا ہوں:

عابدؔ مناوری کے سلام کے یہ تین شعر

ذکرِ غم حسینؑ کی تاثیر دیکھئے پرنم ہے چشم پیکر تصویر دیکھیے
آلِ عباؑ کے ہاتھ میں ہے دین کی سپر بے کار ہے یزید کی شمشیر دیکھیے
عابدؔ سلام آپ کا کتنا ہے جان گداز
مجلس تمام آج ہے دلِ گیر دیکھیے

سردار اوتار سنگھ کے سلام سے یہ چار شعر ۔

رازِ دل آشکار کرتے ہیں ہم تیرا انتظار کرتے ہیں
شمعِ اسلام شہادت کے امین تجھ پہ ہی جان نثار کرتے ہیں
تیر تجھ کو لگا تو یہ جانا اشقیاء ہم پہ وار کرتے ہیں
وردِ لب جن کے ہو علیؑ کا نام وہی طوفاں کو پار کرتے ہیں

پرتپال سنگھ بیتاب کا کے سلام سے یہ انتخاب ملاحظہ کیجیے ۔

وہ تشنگی، صحراؤں میں وہ دھوپ کی شدت آنا تھا جنھیں عرصہ یلغار میں آئے
مفہوم کسی لفظ کا اوڑھے نہ لبادہ جب عزمِ علیؑ کاوشِ اظہار میں آئے
بیتاب وہی لوگ تھے کردار کے پیکر سر لے کے ہتھیلی پہ جو اشرار میں آئے

درج بالا اشعار سے ان شعراء کی عقیدت امام اور فلسفہ کربلا کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔کشمیر کے عصر حاضر کے شعراء کی فہرست میں ڈاکٹر سیّد شبیب رضوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے انھوں نے اپنی تمام عمر شعر و ادب کے گیسو سنوارنے میں صرف کی ہے۔ پروفیسر جعفر رضا ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر شبیب رضوی قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کے اشعار کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی کو یقین نہیں آئے گا۔جی۔

ہاں، چالیس ہزار (میں چشم دید گواہ ہوں) ان میں تقریباً تمام اصنافِ شعر ہیں ۔۔۔نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ، سلام نوحہ وغیرہ۔لیکن وہ اپنے کلام کی اشاعت سے ہمیشہ بے نیاز رہے ہیں''

اگر پروفیسر جعفر رضا کی اطلاع صحیح ہے تو شبیب صاحب جموں وکشمیر کے اس وقت ایسے واحد شاعر ہے جن کے یہاں رثائی شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ موجود ہے۔ان کے ایک سلام سے یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

السلام اے میوهٔ قلبِ رسولؐ　　السلام اے خنکیِ چشمِ بتولؑ
السلام اے نورِ عینِ مُرتضیٰؑ　　السلام اے ہم نصیبِ مجتبیٰؑ
السلام اے بادشاہِ کربلا　　السلام اے موردِ ظلم و جفا
السلام اے بیکس ومضطر حسینؑ　　السلام اے شہر یارِ مشرقین
السلام اے تشنہ لب ، تشنہ دہن　　السلام اے مرکزِ رنج و محن

عصر حاضر میں جموں وکشمیر کے صوبہ جموں سے جہاں خورشید کاظمی ذوالفقار نقوی ، مالک رام آنند، منوہر لا دل ، بیتاب جے پوری، نورالزمان صدیقی نورؔ، منظر عظمی اور لیاقت جعفری وغیرہ کے نام رثائی شاعری کے باب میں اہم ہیں وہی صوبہ کشمیر سے نذیر آزاد، شفق سوپوری، شاہد بدگامی، ہمدم کاشمیری، بشیر بڈگامی، غضنفر شہباز، کفایت فہیم، قتیل مہدی، ڈاکٹر راشد مقبول، شبیر ماگامی، میر شبیر، ڈاکٹر مشتاق حیدر، تنویر طاہر، پرویز مانوس، وغیرہ ایسے شعراء ہیں جو حسینیؑ نظمیں، سلام اور نوحے تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔آخر پر میں ڈاکٹر عظیم امروہوی کے اس اقتباس کو پڑھ کر رخصت چاہوں گا کہ:۔

''رثائی ادب چوں کہ زندہ جاوید کرداروں کے تذکرے پر مشتمل ہے اس لیے لاکھ تلف ہونے کے باوجود بھی اس کا ایک بڑا حصہ آج بھی موجود ہے جسکی وجہ بھی یہ ہے کہ یہ زندہ ادب ہے اس لیے آئندہ بھی زندہ رہے گا اور اس کے جاوداں کردار اسے جاوداں رکھیں گے''

☆☆☆

www.emarsiya.com

دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۲۵۰ مرثیہ نگاروں کے ۳۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔سوزخواں خواتین وحضرات کے لیے بستہ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔

faroghemarsiya@gmail.com

امامِ عصرؑ

شہاب کاظمی

یاد شباب ڈال کے جام شراب میں
''پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں''

کیا کیا بلائیں آکے میرے سر سے ٹل گئیں
میں گم تھا یادِ حضرتِ غیبت مآب میں

آجا یہی بتانے کو اے وارثِ کتاب
کتنے ورق ہیں اور قیامت کے باب میں

قدموں میں سر تو رکھ دیا ہمراہِ منقبت
''جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں''

دیکھا ہے ماہ نیمۂ شعباں کا جب سے چاند
بجلی خوشی سے دوڑ رہی ہے سحاب میں

توبہ کا در کھلا ہوا اس کا ثبوت ہے
کرتا نہیں خدا کبھی جلدی نجات میں

رو رو کہ انکے صید وہ محشر اُٹھائیں گے
تا دیر وہ بھی رہ نہ سکیں گے حجاب میں

جسموں میں قید روحِ بشر ہے بس اتنی دیر
مہمان جتنی دیر ہوا ہے حباب میں

کچھ انکے انتظار نے فرصت نہ دی ہمیں
رہتے جو فکرِ محشر و خوفِ عذاب میں

اپنے بڑوں پہ تجھ کو اگر ناز ہے کوئی
ان جیسا لا جواب کوئی لاجواب میں

پیری میں انکو کس کے کمر ڈھونڈتا ہوں میں
وہ چار دن جو کٹ گئے عہدِ شباب میں

مستِ مئے ولا کو شہابؔ اس کا ڈر نہیں
''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہوں شراب میں''

نوٹ: اِس میں ۳ مصرعے غالبؔ کے صرف ہوئے ہیں۔

تعارف ومسدس میکشؔ غازی پوری

نام: اظہر حسین تخلص: میکش

والد: جناب داروغہ احمد اللہ خاں بہادر ماں: فریدالنسا

تعلیم: انٹرمیڈیٹ تاریخ پیدائش: ۵/جون ۱۹۲۲ء

اسناد: حضرت سروش مچھلی شہری ملازمت: ابتدا میں فوج میں بھرتی ہوئے پھر باٹ کمپنی میں آ گئے

شاگردان: عرشی جون پوری، وفا بنارسی، احسن بنارسی، قالب مرزا پوری وغیرہ۔

اولاد: آفاق حیدر (مولانا الحاج) ذہین حیدر دلکش غازی پوری، اوصاف حیدر، شبیہ نسیم، سنبل نسیم، شعری اظہر

شادی: نسیم علی بنتِ سیّد ضامن علی موضع پہاڑ پور، ضلع اعظم گڑھ

میکش غازی پوری کا خاندان غازی پور کے محلہ سیّد واڑہ کا رہنے والا ہے۔ محلہ مغل پورہ۔ پہاڑ پور بزرگہ وغیرہ میں اراضیاں تھیں۔ چونکہ ان کے والد کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا اس لیے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لیکن دورانِ تعلیم راہی معصوم رضا چونکہ ہم جماعت بھی تھے اور دونوں کے مکان میں کوئی بہت دوری نہیں تھی اس لیے یہ تعلیمی ساتھ دوستی میں بدل گیا جو آخری لمحات حیات تک جاری رہا۔

تعلیم سے علیحدگی کے بعد آپ نے پلی سروس فورس جوائن کی مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تو آپ وہاں سے اپنے بھائی مظہر حسین کے پاس کان پور چلے گئے جہاں انھوں نے ایک فیکٹری میں کام پر لگوا دیا لیکن یہ کام بھی آپ کو پسند نہ آیا تو وہاں سے بنارس چلے آئے اور باٹا کمپنی میں سروس کرنے لگے اور یہیں کام کرتے ہوئے آخری سانس لی۔ انھوں نے حضرت علیؑ کے مشہور خطبات کا منظوم ترجمہ کیا۔

بنارس آپ کو اتنا پسند آیا کہ آپ کے بچپن کے دوست حضرتِ راہی معصوم رضا نے بہت کوشش کی کہ آپ ان کے ساتھ بمبئی چلے جائیں مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ آپ خود کہتے ہیں۔

کاشی کو ہم بھی چھوڑ کے میکش نہ جا سکے
اتنا پسند آ گیا شہرِ حزیںؔ کا رنگ

۱۹۳۷ء میں آپ نے شاعری شروع کی یہی وقت راہی کی بھی شاعری کی ابتدا کا ہے۔ دونوں ہی حضرات نے سروش مچھلی شہری کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ راہی صاحب تو علی گڑھ چلے گئے اور میکش صاحب نے مشاعروں اور مقاصدوں کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ ہندوستان کا وہ کون سا مشاعرہ اور مقاصدہ ہے جس میں انھوں نے شرکت نہ کی ہو۔ اور اصناف سخن میں بھی انھوں نے ہر

ایک کی خاطر خواہ خدمت کی ہے۔غزل، نظم، آزادنظم، قصیدہ، قطعات، مسدس، مثلث، مربع، مخمس، سلام، نوحے، سہرا، نظم تعزیت، قطعہ تاریخ، غرض ہر صنف پر آپ کا کلام موجود ہے۔

بنارس سے نکلنے والے روز نامہ ہندوستان میں آپ برسوں ایک قطعہ حالاتِ حاضرہ پر لکھتے رہے۔تقریباً ۳۰۰ تین سو قطعات تو اب تک موجود ہیں۔اسی درمیان اخبار سے ایک نثری کالم قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔

اب تک آپ کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں۔ نازشِ آدم، آفتاب تازہ، ذبحِ عظیم، ذبیح کربلا، شہیدان وفا حصہ اول، دوم، سوم۔حرفِ نجات، عطرِ مودت۔

مسدّس

اے قلم حمدِ خدا پہلے زباں پر آئے لبِ اظہار پہ تب نعتِ پیمبرؐ آئے
آلِ اطہار کا پھر ذکرِ مطہر آئے (۱) تازگی جس سے رُخِ اہلِ ولا پر آئے
بیت وہ ہو کہ سرِ بزم اُجالا ہوجائے
مرے حق میں وہی جنّت کا قبالا ہوجائے

لائقِ حمد ہے وہ خالقِ اکبر لاریب قابلِ مدح و مودة ہے پیمبرؐ لاریب
ہے سزاوارِ ثنا آلِ مطہر لاریب (۲) سجدۂ شکر کیا خامہ نے لکھ کر لاریب
برتری کا مجھے دعوے کوئی زنہار نہیں
بے بضاعت ہوں مگر اس کا بھی اقرار نہیں

کیا کہوں نوکِ قلم سے مرے کیا ٹپکے ہے ایک ایک حرف سے صہبائے ولا ٹپکے ہے
الفتِ صاحبِ لولاک لما ٹپکے ہے (۳) بادۂ مع شۂِ عقدہ کُشا ٹپکے ہے
جس کے نشّے سے ملائک کو سرور آتا ہے
ہم بلا نوشوں کے چہروں پہ تو نور آتا ہے

نور وہ نور کے ہستی میں چمک ہے جسکی گُلِ گلزارِ محبت میں مہک ہے جس کی
رُخِ حورانِ بہشتی میں جھلک ہے جس کی (۴) عرش منزل ہے گزرگاہِ فلک ہے جس کی
سرمۂ چشم براہیم بھی کہتے ہیں اُسے
اہلِ دل احمدؐ بے میم بھی کہتے ہیں اُسے

بات اشاروں سے وضاحت کی طرف لے آؤ صاف ذہنوں کو کنایوں میں نہ اب الجھاؤ
سب سمجھتے ہوں جسے ایسی ہی باتیں لاؤ (۵) دادِ فن سب سے ملے ایسی ادا اپناؤ
صاف لفظوں میں کرو آلِ عبؑا کی توصیف
جن کی توصیف سے ہوتی ہے خدا کی توصیف

تذکرہ آلِ عبا کا جو زباں پر آیا　اک سمندر تھا جو کوزے میں سمٹ کر آیا
پانچویں فرد کو دیکھا تو جگر تھرّایا (۶) ہونٹ فریاد بہ مائل ہوئے دل بھر آیا
آنکھیں مجبور ہوئیں اشک فشانی کے لیے
جیسے عاشور کو شبیرؑ تھے پانی کے لیے

وہی شبیرؑ جو ہے دوش پیمبرؐ کا مکیں　وہی شبیرؑ جو ہے روشنئ بزمِ یقیں
وہی شبیرؑ جو ہے دولت و سرمایۂ دیں (۷) وہی شبیرؑ جو ہے مالکِ فردوسِ بریں
چھوڑ کر دیس ، غریب الوطنی تک پہنچا
نصرتِ حق میں جو نیزے کی انی تک پہنچا

گھر کا گھر حق کی حمایت میں لٹایا اس نے　جان پر کھیل کر اسلام بچایا اس نے
خونِ دل راہِ صداقت میں بہایا اس نے (۸) دشتِ غربت میں وہ ایثار دکھایا اس نے
بول اُٹھی رحمتِ معبود کہ اب تیرا ہے
جو مرے پاس ہے شبیرؑ وہ سب تیرا ہے

اسی شبیرؑ کا اک بھائی تھا تصویرِ وفا　جس کی محنت سے بڑھی دولت و توقیرِ وفا
نام سے جس کے دعا کو ملی تاثیرِ وفا (۹) جس کا حق ہوگیا منجملۂ جاگیرِ وفا
فخر تھا سبطِ پیمبرؐ کی غلامی پہ جسے
ناز تقدیر کی معراجِ دوامی پہ جسے

بھول سکتا ہے بھلا کون وفائیں اس کی　یادگار اہلِ وفا کیوں نہ منائیں اس کی
کیوں نہ تصویر الم دل پہ بنائیں اُس کی (۱۰) لیں بتولِؑ عذرا نے بھی بلائیں اس کی
قوتِ بازوئے شاہِ شہدا تھا عباسؑ
بخدا فاتحِ خیبر کی دعا تھا عباسؑ

''ع'' عباسؑ کی ہے چشمِ علیؑ کی ٹھنڈک　''ب'' علامت ہے بزرگی کی بعنوان جلی
''الف'' اس کا اسداللہ کی مانند قوی (۱۱) ''س'' سقائی کی جانب اک اشارہ ہے خفی
زندگی وقف تھی مشکیزہ اُٹھانے کے لیے
جان دی پیاس سکینہؑ کی بجھانے کے لیے

ایک دن سنتے ہیں عباسِؑ جری کی مادر　چوم کر چاند سی پیشانی ، بلائیں لے کر
لگیں کہنے کہ یہ ماں صدقے جواں بازو پر (۱۲) تم بھی ہو نورِ نظر نورِ نگاہِ حیدر
رات دن دلبرِ زہراؑ کی غلامی پھر کیوں
ان کی چوکھٹ پہ شب و روز سلامی پھر کیوں

تم جواں قلب جواں عزم جواں ہے بیٹا دیکھ کر تم کو لہو تن میں رواں ہے بیٹا
تم سلامت ہو تو زندہ بھی یہ ماں ہے بیٹا (۱۳) تم سا عالم میں کوئی اور کہاں ہے بیٹا
تم بھی فرزندِ شہِؑ قلعہ کشا ہو سمجھو
عزت و رتبہ و توقیر میں کیا ہو سمجھو

کانپ اُٹھا سن کے وہ جرّار یہ مادر کے سخن تھر تھرانے لگا غیرت سے دلاور کا بدن
ماں کے رتبے سے جو آگاہ تھا وہ رشکِ چمن (۱۴) عرض کی فرطِ ادب سے یہ جھکا کر گردن
ایسی سخن کی مرے مولا جو ہوا پائیں گے
جیتے جی پھر انھیں ہم منھ نہ دکھا پائیں گے

ہیں سبب خلقتِ کونین کا احمدؐ کہ نہیں کل بلاؤں کا اسی نام سے ہے رد کہ نہیں
پاک ہر رجس سے شبیرؑ کے ہیں جد کہ ہیں (۱۵) بیٹا کہتے تھے نواسوں کو محمدؐ کہ نہیں
اس شرف پر تو زمانے کا زمانہ صدقے
میں تو کیا ان پہ مرا سارا گھرانہ صدقے

مرا ناناؑ بھی رسولؐ دو سرا ہو تو کہیں میری نانی بھی خدیجہ سے بھلا ہو تو کہیں
آپ میں وصفِ بتولِؑ عذرا ہو تو کہیں (۱۶) مجھ کو فرزندِ پیمبرؐ نے کہا ہو تو کہیں
بھائیوں میں مرے ہمشانِ حسن ہے کوئی
کہیئے زینبؑ سی کہیں میری بہن ہے کوئی

ان کا احساں ہے اگر مجھ کو برادر سمجھیں اس پہ اصرار نہیں اوروں سے بہتر سمجھیں
یہ بھی عزت ہے جو ہم مرتبہ قنبر سمجھیں (۱۷) یہ بہت ہے جو غلامِ علی اکبرؑ سمجھیں
میں تو قطرہ ہوں مگر بحرِ فضیلت ہیں حسینؑ
آپ بھی جانتی ہیں مالکِ جنّت ہیں حسینؑ

فرطِ جذبات سے تھرانے لگیں اُمّ بنینؑ مچھلیاں چوم کے بازوئے پسر کا بولیں
تم پہ سو جان سے ماں صدقے مرے ماہ جبیں (۱۸) مطمئن قلب ہوا آج ہوا دل کو یقیں
بار آور مری برسوں کی ریاضت ہوگی
اب مجھے بنتِ پیمبرؐ سے نہ خفت ہوگی

اُن کے شہزادوں کے قدموں پہ جو سر رکھتے ہو روز و شب صبح و مسا شام و سحر رکھتے ہو
تم جو شبیرؑ کی خدمت میں نظر رکھتے ہو (۱۹) دل میں جذبات غلامی کے اگر رکھتے ہو
جو مرے دودھ کا حق ہے وہ ادا ہوتا ہے
چشم زہراؑ میں شرف میرا سِوا ہوتا ہے

پنجاب کی خواتین مرثیہ نگار

ڈاکٹر ریحان حسن (شعبہ اردو، فارسی اور عربی)

پنج دریاؤں کی سرزمین پنجاب کی گیتی پر اردو کے ادب کے کئی اہم قلم کار پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات کے حوالے سے ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ شاید ہی اردو کا کوئی قاری ہو جو مولانا الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، ساحر لدھیانوی، ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کی ادب میں بیش بہا خدمات کا قائل نہ ہو۔ ایسا نہیں کہ اردو ادب میں پنجاب کے صرف مرد قلم کاروں نے ہی اہم خدمات کی ہیں بلکہ صنف نسواں نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ وقیع تخلیقات پیش کی ہیں لیکن ان کے خدمات کا اعتراف جس طرح ہونا چاہیے نہ ہو سکا چنانچہ بہت سی خواتین کے علمی کارنامے پردہ خفا میں رہ گئے۔ جس طرح ادب کی نثری اصناف میں خواتین نے اپنی ذہنی جودت اور فکری بصیرت کو بروئے کار لا کر رنگارنگ گل بوٹے کھلائے ہیں بعینہ اصناف نظم میں بھی عورتوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔

اصناف نظم میں مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں طبع آزمائی آسان امر نہیں کیونکہ اردو ادب میں مرثیہ ایسی صنف ہے جس میں نظم کے مجملہ اصناف کی خوبیاں پائی جاتی ہیں اس لیے مرثیہ نگار کو اردو کی اصناف نظم سے واقفیت ضروری ہے تبھی اس صنف میں قدم رکھ کر کامیابی مل سکتی ہے چنانچہ جب ہم پنجاب میں مرثیہ نگار خواتین کی تلاش کرتے ہیں تو نوحہ وسلام کی صنف میں طبع آزمائی کرنے والی خواتین مل جاتی ہیں لیکن مرثیہ نگار شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں جبکہ مرثیہ کے فروغ میں اس سرزمین کے ادباء کا بھی کچھ کم حصہ نہیں، میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد پنجاب کے مرثیہ نگاروں کے مراثی بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ شخصی مراثی میں مولانا الطاف حسین حالی کا مرثیہ غالب اور حکیم محمود خاں کا مرثیہ اس کے علاوہ علامہ اقبال کا حالی کے مثل غالب کا مرثیہ نیز حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام میں اسلام کی منظوم تاریخ کے ساتھ مرثیے کے محاکات اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے شخصی مرثیوں میں مرثیہ پنڈت نہرو، مرثیہ ذاکر حسین، مرثیۂ اقبال اور حضرت امام حسین کے حضور مرثیہ حسین قیصر بارہوی کا شباب فطرت، معراج بشر، عظیم مرثیے، ڈاکٹر صفدر حسین کا آئین وفا علمدار کربلا، جلوہ تہذیب، چراغ مصطفوی، مقام شبیری، فیض احمد فیض کا امام حسین کی شان اقدس میں مرثیہ مجموعۂ کلام 'شام شہر یاراں' میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انبیاء اللہ حیدر رضیاء کا قرطاس عزاء، قرآن دفا، نجوم فن وغیرہ ایسے مرثیے ہیں جن کی مرثیہ کی تاریخ میں بیحد اہمیت ہے۔ جہاں تک پنجاب میں صنف مرثیہ میں طبع آزمائی کرنے والی خواتین کی بات ہے تو ہمیں صرف دو خاتون ایسی ملتی ہیں جنہوں نے اس صنف کی جانب باقاعدہ توجہ کی تقسیم سے قبل تو پنجاب میں اردو زبان کا چلن اور بول بالا تھا لہٰذا اردو کی تمام اصناف میں یہاں کے تخلیق کاروں نے نمایاں کارنامے انجام دیے اسی طرح عورتوں نے بھی ادب کی مختلف میں اپنے جوہر کمال دکھائے لیکن حجاب اور معاشرہ کی قائم کردہ روایات اور اصولوں کی پاسداری کے سبب ان کی ادبی خدمات کماحقہ سامنے نہ آسکیں چنانچہ پنجاب کی وہ خواتین جنہوں نے نوحہ وسلام کی صنف کے ساتھ ساتھ مرثیہ میں بھی فکری بصیرت کا ثبوت

بہم کیا ان کے نام تاریخ کی بے رحمی اور مرداساس معاشرہ کی نذر ہو کر رہ گئے پھر بھی پنجاب کی جن عورتوں کے مرثیے ملتے ہیں وہ اپنے بلندی تخیل، جذبات کی شدت اور شعور کی گہرائی و گیرائی کے سبب صرف مرثیہ ہی نہیں بلکہ نسائی ادب میں بھی اہم اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پنجاب کی مرثیہ گو خواتین میں لدھیانہ کی بانو نقوی کا نام قابل ذکر ہے۔ سید محمد عسکری کی اس ہونہار دختر نے محض دس سال کی عمر میں صنف نوحہ کی جانب توجہ کی ۱۹۴۵ء میں پہلا نوحہ کہا جسے سید ظہیر الدین اور آغا حسین ارسطو جاہی کو سننے کا موقع نصیب ہوا۔ انہوں نے یہ اندازہ کیا کہ بانو نقوی میں ایک فنکار چھپا بیٹھا ہے جسے اس موقع پر مہمیز نہ کیا گیا تو ادب کا عظیم نقصان ہوگا لہٰذا انہوں نے بانو نقوی کی حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں بانو نقوی کو شعر و ادب کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع فراہم ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک آزاد ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ملک میں فسادات پھوٹ پڑے جس کے سبب لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے چنانچہ یہ دودمان بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں میاں چنو میں آباد ہو گیا۔ اس ہجرت کے المیہ کے وقت شہر بانو کی عمر ۱۲ برس تھی۔ کمسن بچی کے ذہن پر ان دلدوز واقعات کے جو اثرات مرتب ہوئے اس کی بازگشت بانو نقوی کے مرثیوں میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے مرثیہ 'بنی ہاشم' میں ہجرت کا کرب اور درد جھلکتا ہے۔ یہ مرثیہ ۶۲ بند پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کے آغاز میں ہی محبت کا تذکرہ ہے۔ محبت کے مختلف انداز کو پیش کرتے ہوئے شہر بانو نے یہ باور کرایا ہے

قائم ہے محبت سے ہی یہ معمورۂ عالم　　جذبات محبت کے ابھر آتے ہیں پیہم
تاثیر محبت سے ہی آنکھیں ہوئیں پر نم　　اس طرح محبت میں ہی ہم کرتے ہیں ماتم
رونے ہی سے ہوتی ہے جلا قلب و نظر میں　　رونے سے اضافہ ہوا اوصافِ بشر میں

دراصل بانو نقوی نے اس مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ سے محبت پر زور اس لیے دیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنی خدمات کے صلے میں بحکم قرآن "قل لا اسئلکم علیه اجرا الاالمودت فی القربی "یعنی اے رسولؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اجر رسالت کچھ بھی نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے اہلِ بیتؑ سے محبت کرو طلب کیا تھا لہٰذا حسینؑ کے غم میں گریہ و ماتم ثبوت محبت ہے۔ جب انسان میں اوصاف بشر ہوں گے تبھی کسی کی مصیبت پر دکھ درد ہوگا اور آنکھوں میں آنسو ہوں گے یعنی آنسو کسی طرح کی کمزوری نہیں بلکہ انسانیت کے لیے دل میں درد کا اظہار ہے۔ بلاشبہ آنسو قلب و نظر کی جلا کا سبب ہوتا ہے اور آنسو ہی دل کی بیماری کا مداوا بھی ہوتا ہے۔ شاعرہ نے غمِ امام حسینؑ میں گریہ پر زور غالباً اس لیے بھی دیا ہے کہ وہ یہ مانتی ہیں غم امام حسینؑ ایسا غم ہے جس پر اشک فشانی سے دنیا و آخرت بھی سنورتی ہے۔ بانو نقوی نے امامؑ عالی مقام پر اشک شوئی کے ساتھ ساتھ تذکرۂ حسینؑ پر بھی زور دیا ہے کیونکہ امام حسینؑ کا دین اسلام پر عظیم ترین احسان ہے۔

آمد ہے محرم کی، بڑا دل کو قلق ہے　　سینہ غمِ شبیرؑ میں کونین کا شق ہے
رنگِ رُخِ خورشید بھی اس صدمے سے فق ہے　　مظلوم پہ یوں روؤ کہ جو رونے کا حق ہے
احساں ہے بڑا دین پہ شاہِؑ دو جہاں کا　　سُن لو کہ یہ ہے تذکرہ سردارِ جہاں کا

بانو نقوی کے مرثیہ کے بند کے آخری مصرعہ میں حدیث رسولؐ کی طرف عالم اسلام کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس میں آپ نے حضرت

امام حسینؑ کے متعلق ارشاد فرمایا' ان الحسنؑ والحسینؑ سیّدا شباب اہل الجنۃ' یعنی حسنؑ وحسینؑ جنت کے مردوں کے سردار ہیں۔شہر بانو کے مرثیوں میں ہمیں منظر نگاری،قلبی جذبات کی عکاسی اور الفاظ کا خوبصورت استعمال بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔بانو نقوی کے مراثی میں ہمیں میر انیسؔ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ایسا شاید اس لیے بھی ہو کہ آپ کی والدہ گرامی جناب شریف العلما کی پوتی تھیں جنہیں میر انیس کے مرثیے زبانی یاد تھے۔اس مرثیہ کا اختتام بھی انیسؔ کا اتباع کرتے ہوئے شاعرہ نے کچھ یوں کہا ہے۔

بانو یہ بصد عجز دعا مانگ خدا سے　　اس سال زیارت کروں حضرت کی دعا سے
امید بڑی ہے مجھے مولا کی عطا سے　　سب کچھ ہمیں مل جائے درِ آلِ عبؑا سے
سب کام سر انجام ہوں ، عباسؑ کا صدقہ　　پورے میرے سب کام ہوں،عباسؑ کا صدقہ

پنجاب کی دوسری مرثیہ نگار خاتون 'بورے والا' میں ۱۹۹۰ء میں اس خاکدان عالم پر آنے والی تسنیم نقوی ہیں جن کے آٹھ مراثی پر مشتمل مجموعہ ''معصوم پیاسے کربلا میں'' کے عنوان سے بورے والا کے ایک پبلشر نے شائع کیا ہے کہ جس کی اشاعت کے بعد کچھ حلقوں نے تنقید کی کہ جس کا دفاع کلیم شہزاد کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ہمیں اس مجموعہ کو استاد مرثیہ نگار شعرا کے متعین کیے ہوئے معیار پر نہیں پرکھنا چاہیے کیونکہ ابھی ابتدائی سفر ہے۔جیسے جیسے آگے مسافتوں سے واسطہ پڑے گا۔منزلوں کی نشاندہی ہوگی تو مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی بڑھے گا۔(اردو مرثیے کا سفر (بیسویں صدی کے مرثیہ نگار) عاشور کاظمی صفحہ ۱۱۵۹) کلیم شہزاد کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کیونکہ ایک خاتون کے پہلے مجموعہ کی اس قدر سخت تنقید درست نہیں۔سچ تو یہ ہے کہ تسنیم نقوی کا اس میدان میں قدم رکھنا ہی لائق تحسین ہے۔چونکہ خواتین کو مرد اساس معاشرہ میں اپنی جگہ بنانا اور صلاحیتوں کا اعتراف کروانا انتہائی دشوار ہے کیونکہ عورتوں کو نہ جانے کیسے کیسے بندھنوں اور دیو قامت بتوں کو توڑ کر رہ گزر بنانا پڑتا ہے ایسے میں اگر کوئی خاتون ادبی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرتی ہے تو وہ بلا شبہ قابل تعریف ہے۔تسنیم نقوی کے مرثیوں میں ہمیں سوز وگداز اور جذبات نگاری کی بہترین تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ ہو۔

کیسے تھے درد ظالموں دل پر سہے حسینؑ　　اصغرؑ کی لاش گود میں لے کر چلے حسینؑ
خیموں میں لا کے لاش کو رکھا تھا سامنے　　جو پوچھتی تھی بیبیاں کیسے کہے حسینؑ
اصغرؑ چلا گیا ہے جو لختِ بتولؑ تھا
مارا ہے اس کو تیر جو آلِ رسول تھا

مختصر یہ کہ پنجاب میں خواتین مرثیہ نگاروں کی تلاش وجستجو انگلیوں پر شمار کر لیے جانے کے قابل ہے ایسا اس لیے بھی کہ مردوں کو جو سہولیات اور مواقع فراہم ہیں وہ خواتین کو میسر نہیں۔اس کے علاوہ تقسیم کے بعد اردو کی پہلی جیسی صورت حال پنجاب میں برقرار نہ رہی جس کے نتیجے میں پنجاب میں اردو کا زوال ہوا تو اس کا اثر مرثیہ کی صنف پر پڑنا بھی ناگزیر تھا اس کے باوجود مندرجہ بالا خواتین کا مرثیہ گوئی کی جانب توجہ کرنا اور اس صنف میں قابل ذکر مرثیہ نگار بن جانا ہی کارے دارد کا مصداق ہے۔

غیر مطبوعہ مرثیہ ماتم

ڈاکٹر سیّد مظہر عباس رضوی

سوز و سلام و مرثیہ نوحہ ہے زندگی ہر دم غمِ حسینؑ میں گریہ ہے زندگی
وقفِ عزا نہ ہو تو بھلا کیا ہے زندگی (۱) کرب و بلا میں آج بھی گویا ہے زندگی
قصرِ یزیدی لرزاں و ترساں اِسی سے ہے
رونق جہاں میں ہے تو فقط ماتمی سے ہے

ہر وقت ہے حسینؑ کا غم اُس کا کام کاج ہے ماتمی کے دم سے عزائے حسینؑ آج
سینہ زنی ہے اصل میں پُرامن احتجاج (۲) سمجھے نہ اس کو کوئی فقط رسم یا رواج
کیسی عجیب اس میں ہے تاثیر کیا کہیں
ماتم ہمارے سینے پہ اور درد ہے اُنہیں

شعلہ اِدھر فروزاں ، دمِ سرد اُس طرف گلگوں ہے چہرہ یاں تو رُخ زرد اُس طرف
ہم درد اِس طرف ہیں تو بے درد اُس طرف (۳) سینہ زنی اِدھر ہے تو ہے درد اُس طرف
شق ماتمی کا سینہ ہے ماتم کی ضرب سے
کچھ کم نہیں ہے یہ کسی سامانِ حرب سے

یہ احتجاج کرنے کا بھی خوب ڈھنگ ہے ظلم و ستم نے دیکھا کہاں ایسا رنگ ہے
مظلومیت اسی کے سہارے دبنگ ہے (۴) خالی ہے ہاتھ جس میں نہ لاٹھی نہ سنگ ہے
ظالم کے چہرے سے جو عیاں اتنا کرب ہے
سینے پہ اپنے ، دل یہ مگر اُس کے ضرب ہے

نوحہ گری ہو سینہ زنی کے جو ہم رکاب ماتم سے ظلم و جور کے چہرے پہ اضطراب
ماتم کرے گا ظلم کا اک روز احتساب (۵) انسانیت کو دیتا ہے یہ درسِ انقلاب
سینے میں جو چھُپی ہے یہ اِک درد کی صدا
کرتی ہے دل فگار یہی ماتمی صدا

ماتم سے حق کی ہوتی ہے تشہیر جابجا ظلمت میں اس کے دم سے ہے تنویر جابجا
جور و جفا کو کرتا ہے تسخیر جابجا (۶) ہے اس سے قلب و روح کی تعمیر جابجا
شک کی فضا میں ہے یہی ایقان کی دلیل
سینہ زنی ہے قوتِ ایمان کی دلیل

جوشِ جنوں نہیں کوئی غیض و غضب نہیں ماتم کے دائرے میں کوئی بے ادب نہیں
دل کی صدا ہے یہ کوئی شور و شغب نہیں (۷) ماتم وہ احتجاج ہے کہ جس کے لب نہیں
بے چارگی کی ہے، یہ ہے بے آس کی زباں
ماتم کے پاس صرف ہے احساس کی زباں

زنجیرِ ظلم توڑنے کا جب ملا نہ حل کوئی بھی کرسکا نہ نظامِ جفا کو شل
سینے پہ ماتمی نے کھلائے ہیں تب کنول (۸) نوحہ گری ہے سُنّتِ سجّادؑ پر عمل
سوتے ہوؤں کو یہ ہے جگانے کے واسطے
ماتم فقط نہیں ہے رُلانے کے واسطے

نوحہ گری و سینہ زنی کی یہ کیفیات گر غور کیجیے تو یہ ہیں جزوِ نفسیات
ہنسنے کے ساتھ رونے کی قرآں کرے ہے بات (۹) رونے سے ہی تو جاری ہے خونِ رگِ حیات
اس کے بغیر ہوتی نہیں زندگی نصیب
روئے اگر نہ طفل تو رُلواتے ہیں طبیب

بیکار بحث سے یہ نکلنے کی ہے سبیل قرآں کو اس کے ذیل میں اب کیجیے وکیل
ہے اس کے پارہ دس، رکوع سترہ میں یہ دلیل (۱۰) روتا زیادہ، ہنستا ہے کم مومنِ اصیل
آوارہ ذہن کے لیے گریہ لگام ہے
حیرت ہے اس پہ جو کہے رونا حرام ہے

پارہ نمبر دس، رکوع سترہ

جو یہ بھی مانتا نہ ہو پارہ چھٹا اُٹھائے اللہ کا کلام ہے میری نہیں ہے رائے
''مظلوم کو روا ہے وہ آنسو اگر بہائے'' (۱۱) جو ہو ستم رسیدہ کرے کیوں نہ ہائے وائے
آلام و رنج و غم تو اُنہیں آزماتے ہیں
محبوب ہیں خدا کو، جو آنسو بہاتے ہیں

پارہ ۶ رکوع ۱

رونے سے ہوتی کم نہیں کچھ عبدیت کی شان آدمؑ بھی روئے سخت تھا کچھ اتنا امتحان
ایوبؑ گریہ کرتے تھے تکلیف میں تھی جان (۱۲) یونسؑ بہاتے رہتے تھے آنسو ہر ایک آن

معلوم تھا کہ زندہ ہیں یوسفؑ بھی گو اُنہیں
یعقوبؑ روتے رہتے تھے بیٹے کی یاد میں
پارہ ۱۳ رکوع ۴

کرتے تھے سب شہیدوں پہ جب نالہ و بکا بعدِ ''اُحد'' کتابوں میں یہ ہے لکھا ہوا
حمزہؑ چچا پہ رونے کو کوئی نہیں ہے کیا (۱۳) سن کر یہ نوحہ پوچھتے تھے سب سے مصطفیٰ ﷺ
اصحاب نے جو بھیجیں وہاں اپنی بیبیاں
گونجا زمیں سے تا بہ فلک نالہ و فغاں

سیرت النبی از مولانا شبلی نعمانی صفحہ نمبر ۱۲۵

آنسو نکل ہی پڑتے ہیں دل پر ہو جب اثر فطرت کے یہ اصول ہیں ان سے نہیں مفر
بیٹی کا گھر اُجڑنے پہ ہوتے تھے نوحہ گر (۱۴) یہ بھی پڑھا ہے ہم نے کہیں حضرتِ عمر
کیا کیجیے بتائے کوئی دل ملول کا
کنبہ اُجڑ گیا ہو جو سارا بتولؑ کا

معارج النبوہ رکن چھارم صفحہ نمبر ۹۶

آئے حضور ﷺ روتے بن عباسؑ کو نظر مشکواۃ و بیہقی میں روایت ہے معتبر
پوچھا یہ حال کیوں ہوا اے شاہِؐ بحر و بر (۱۵) بکھرے ہوئے تھے بال ، تو منہ آنسوؤں سے تر
فرمایا کربلا میں یہ ظلم و ستم ہوا
میرا حسینؑ قتل ہوا اُف غضب ہوا

مٹّی کو گھر میں لائے اُٹھا کر شہہ ہُدا منسوب اُمِّ سلمیٰ سے بھی ہے یہ واقعہ
وہ بولے الفراق دن اک ایسا آئے گا (۱۶) پوچھا کہ خاص بات ہے مٹّی میں کوئی کیا
مٹّی سے خون اُبلے گا اُس روز بالیقیں
بیٹے کو میرے قتل کریں گے جو اہلِ کیں

مشکواہ شریف جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۲۷۵

اُن کو اویسؑ قرنی کی دہراؤ داستاں ماتم پہ جو اُٹھاتے ہیں حضرات اُنگلیاں
دندان اپنے توڑ دیئے سارے الاماں (۱۷) سُن کر ، شہید شہہ کا ہوا دانت در دہاں
منصب اویسؑ جیسا ہی پاتے ہیں ماتمی
جو مجلسوں میں خون بہاتے ہیں ماتمی

روتے ہیں آپ کس لیے؟ ، زندہ شہید ہے اکثر یہ اعتراض بھی ہوتا مزید ہے
سمجھائیں کیا کہ ذہن ہی جس کا پلید ہے (۱۸) خوشیاں منایئے کہ محرم تو عید ہے

یعنی کہ بچ گیا تھا براہیمؑ کا پسر
کیا سوگ سب منائیں گے اب عیدِ بقر پر

تاریخ کے ورق ذرا اُلٹا کے دیکھیے ظالم نے ہر زمانے میں ظلم و ستم کیے
لیکن جو ظلم بر سرِ کرب و بلا ہوئے (۱۹) وہ دیکھ کر بڑے بڑے ظالم بھی رودیئے
منہ کو کلیجہ آئے وہ ظلم و ستم کیا
صد حیف اس پہ رونے بھی ہرگز نہیں دیا

اپنے غموں پہ دل جو بھر آیا تو رو لیے جب معصیت نے دل کو ستایا تو رو لیے
محبوب سے وصال نہ پایا تو رو لیے (۲۰) خوف و ملال کا ہوا سایہ تو رو لیے
دل رو رہا ہے ایسے مسلماں کے حال پر
بدعت جو سمجھے رونا محمدﷺ کی آل پر

سیوطی کی کتاب پڑھیں ، داستاں نہیں روئے غمِ حسینؑ میں افلاک اور زمیں
جنّات اور فرشتوں نے ماتم کیا وہیں (۲۱) سورج کو گہن لگ گیا ، اور آندھیاں چلیں
سرخی شفق کی جو نظر آتی ہے رات دن
اس غم کو کائنات مناتی ہے رات دن

مسلم شریف، سرالشہادتین

آنسو بہائے جس نے عزائے حسینؑ میں لینے لگا وہ سانس فضائے حسینؑ میں
جاں اپنی جس نے دی ہے ولائے حسینؑ میں (۲۲) وہ جانے کتنا درد ہے 'ہائے حسینؑ'' میں
کرتی ہے شق کلیجہ نکل کر صدائے غم
دل بے قرار ہوتا ہے رہتی ہے آنکھ نم

زنجیر ہو قمہ ہو کہ ہوں ہاتھ سینہ زن مقصد عزائے شاہؑ کا ہے نالہ و محن
کم اس طرح سے ہوتی ہے کچھ قلب کی گھٹن (۲۳) یہ ذکر تازہ کرتا ہے ہر مضمحل بدن
غم سے اگرچہ سینہ و دامان چاک ہیں
چہرے مگر حسینیوں کے تابناک ہیں

دکھلا رہا ہے نام و نسب ماتمِ حسینؑ بتلا رہا ہے سب کے حسب ماتمِ حسینؑ
ہو صبح و شام دن ہو کہ شب ماتمِ حسینؑ (۲۴) مظلوم ہوں جہاں کریں سب ماتمِ حسینؑ
بیدار اس سے ہوتا ہے احساس اور شعور
ظلمت دلوں سے بھاگتی ہے آئے جب یہ نور

ہر سو جہاں میں ہوتی تھی تحقیرِ آدمی   درپے تھے سب مٹانے کو تصویرِ آدمی
فرشِ عزا نے بدلی ہے تقدیرِ آدمی (۲۵) فرشِ عزا ہے باعثِ توقیرِ آدمی
ملتا یہاں سے ہے ہمیں انسانیت کا درس
فرش عزا پہ ہوتا ہے حقّانیت کا درس

فرشِ عزا بچھائیں جو وہ خوش نصیب ہیں   خوش بخت ہیں وہ آلِ نبیؐ کے قریب ہیں
اللہ کے حبیب کے وہ تو حبیب ہیں (۲۶) دل کے غنی ہیں ، مت کہو ان کو غریب ہیں
آتے ہوں پنجتنؑ جہاں مجلس کے واسطے
اُس کو غریب خانہ نہیں کہنا چاہیئے

فکرِ حسینیت کی ہیں شہکار مجلسیں   طرزِ یزیدیت پہ کریں وار مجلسیں
باطل سے یوں ہیں برسرِ پیکار مجلسیں (۲۷) پڑھتے ہیں پڑھنے والے سرِ دار مجلسیں
بے خوف جان دیتے ہیں اس ذکر کے لیے
میثمؑ زبان دیتے ہیں اس ذکر کے لیے

ذکرِ علیؑ و آلِ علیؑ گر ہو مستقل   ہوتی نہیں وہاں پہ کبھی روح مضمحل
یہ ذکر وہ ہے جو کرے مضبوط سب کے دل (۲۸) ذکرِ حسینؑ کرتا ہے زخموں کو مندمل
حاصل یہاں سے ہوتی ہیں دنیا کی نعمتیں
اس ذکر سے ہیں سارے جہانوں کی رونقیں

فرشِ عزا تو گھر کو بنائے فلک مقام   فرشِ عزا پہ حمدِ خدا ، نعت اور سلام
فرشِ عزا پہ آتے ہیں افلاک سے امامؑ (۲۹) فرشِ عزا سے فاطمہ زہرؑا کریں کلام
''بیٹھی ہُوں نورِ عین کے پُرسے کے واسطے
آئے کوئی حسینؑ کے پُرسے کے واسطے''

دشتِ بلا میں مارا گیا جب مرا پسر   دوڑائے گھوڑے ظالموں نے اس کی لاش پر
تھے اتنے تیر چہرہ ہی آتا نہ تھا نظر (۳۰) دیتی تھی بوسہ جس کو وہ تھا خوں میں تر بہ تر
بالوں میں گرد ، ریش تھی خوں سے بھری ہوئی
زخمی بدن پہ خاک تھی ساری ملی ہوئی

گردن سے جس طرح سے علیحدہ کیا تھا سر   ایسے تو ذبح کرتا نہیں کوئی جانور
دل کو سکون دیتا تھا جو پارۂ جگر (۳۱) کیسے تڑپ رہا تھا وہ صحرا کی ریت پر
سامانِ ضرب اس پہ سبھی آزمائے تھے
کتنے ہی زخم اک تنِ اطہر پہ آئے تھے

خوں بار چہرہ ، جسم تھا سارا لہو لہو تھا سامنے وہ آنکھوں کا تارہ لہو لہو
ایسے نہ دیکھے ماں کوئی لاشہ لہو لہو (۳۲) اک دوپہر میں تھی مری دنیا لہو لہو
مارے تھے ظالموں نے سبھی تیر سامنے
کاٹی تھی ہائے گردنِ شبیر سامنے

خیمے کا پردہ اٹھتا تھا گرتا تھا بار بار اک مضطرب سا چہرہ نکلتا تھا بار بار
بیمار کوئی گرتا سنبھلتا تھا بار بار (۳۳) اور میری جان کوئی مسلتا تھا بار بار
بیمار بیٹا تھا کہ وہ تھی مضطرب بہن
چہرے پہ گردِ رنج و الم درد اور محن

چھائی ہوئی تھی چاروں طرف اک فضائے خوں کچھ بھی دکھاتی دیتا نہیں تھا سوائے خوں
صحرا نے اوڑھ رکھی تھی سر پر ردائے خوں (۳۴) منظر یہ دیکھ کر نہ کیوں آنکھوں میں آئے خوں
کھینچیں لعین صحرا میں لاشِ حسینؑ کو
ماں کس طرح سے روکے بھلا اپنے بین کو

دیکھا نہ ہوگا ایسا فلک نے کبھی بھی حال سبطِ نبیؐ کی لاش ہو صحرا میں پائمال
سہہ شعبہ تیر اور علی اصغرؑ سا نونہال (۳۵) تیروں سے چھلنی اکبرؑ ذیشان و پُرجمال
اس ظلم پر نہ روئیں تو آخر بتائیں کیوں
بالوں کو کھولے فاطمہ زہراؑ نہ آئیں کیوں

یارب کسی کا بھی نہ ہو ایسا شقی کا دل تڑپائے خاک پر جو بتولؑ و علیؑ کا دل
تھا وحشیوں کا ، اُن میں نہ تھا آدمی کا دل (۳۶) ایسے کوئی دُکھاتا ہے اپنے نبیﷺ کا دل
سُن کر یہ واقعات بھلا کس کو ہوش ہو
کیا ایسے سانحے پہ مسلماں خموش ہو

اصغرؑ پہ تیرِ ظلم چلے آنکھ نم نہ ہو اکبرؑ جواں کو برچھی لگے آنکھ نم نہ ہو
قاسمؑ فرس سے نیچے گرے آنکھ نم نہ ہو (۳۷) خیموں سے آگ اٹھتی رہے آنکھ نم نہ ہو
بچے پیاسے روتے رہیں اور چپ رہیں
سجادؑ پا برہنہ چلیں اور چپ رہیں

اس ظلم پر نہ آنسو بہائیں تو کیا کریں دل کی فغاں کو لب پہ نہ لائیں تو کیا کریں
سر پیٹ کر بھریں جو نہ آہیں تو کیا کریں (۳۸) دینِ خدا کو یوں نہ بچائیں تو کیا کریں
آنسو ضمیرِ خفتہ کو ہر دم جگاتے ہیں
انصاف کے چراغ یہاں جھلملاتے ہیں

منظر یہ بھول سکتی ہے دادی کوئی بھلا پوتے کو اس کے تیر لگے وا مصیبتا
چمٹے بدن سے خون میں لتھڑی ہوئی قبا (۳۹) خوں منہ سے وہ اگلنے لگے دودھ کی جگہ
جس لاش کا سنبھالنا مشکل ہو تیر کو
ماں کیسے دیکھ سکتی ہے ایسے صغیر کو

ننھی سی جان کانپے بدن سارا تھرتھرائے تیرِ ستم کو کھینچنا چاہیں ، نکل نہ پائے
معصوم بازوؤں میں پڑا مٹھیاں دبائے (۴۰) چہرہ خموش لب پہ نہیں کوئی ہائے ہائے
بچہ نکالے جب کبھی سوکھی زبان کو
دیکھے پدر زمیں کو کبھی آسمان کو

گردن سے خون بہتا رہے باپ کیا کرے بچہ بلک کے روتا رہے باپ کیا کرے
منہ سے وہ خوں اُگلتا رہے باپ کیا کرے (۴۱) حسرت سے چہرہ تکتا رہے باپ کیا کرے
اکڑائے جسم سارا وہ مٹھی کو بھینچ کر
یوں منقلب ہو ہاتھوں پہ اک آہ کھینچ کر

ہائے کسی پدر کو خدا یہ نہ دن دکھائے بے آس ، بے سہارا وہ میّت کو خود اُٹھائے
لاشے کو لے کے سات قدم آگے پیچھے جائے (۴۲) دکھیاری ماں کو کیسے وہ یہ سانحہ بتائے
لے کر گیا تھا پیاس بجھانے کے واسطے
خیمے میں لاش لایا ، رُلانے کے واسطے

دیکھا ہے سیّدہ نے یہ منظر بھی دلخراش قاسمؑ سا گلبدن سرِ میداں ہے قاش قاش
اک خاک کا غبار ہے کچلی ہوئی ہے لاش (۴۳) بوڑھا چچا بھتیجے کو ہر سُو کرے تلاش
برباد کس طرح سے یہ نخلِ حسنؑ ہوا
پیوندِ خاک ہائے یہ گُل پیراہن ہوا

ماں در پہ خیمے کے ہے پریشان مضطرب سیدانیاں ہیں بے سروسامان مضطرب
پیوست سینے میں بھی ہے پیکان مضطرب (۴۴) اور مضمحل چچا سرِ میدان مضطرب
یہ سوچتے ہیں سیّدِ سردار کیا کریں
قاسمؑ کے ٹکڑے چُننے کا طے مرحلہ کریں

گٹھڑی بنا کے لاش اُٹھائی حسینؑ نے یوں نوجوانی اپنی دکھائی حسینؑ نے
غیض و غضب سے چھوڑی ترائی حسینؑ نے (۴۵) للکاری پھر سے ساری خدائی حسین نے
آئے تو حوصلے سے نہ پھر ضبط کرسکے
گٹھڑی کو کھولا ، لاش رکھی اور رو پڑے

کربِ و بلا میں صبح سے تا شام جو ہوا آساں بیان کرنا نہیں غم کا ماجرا
اک سہ پہر میں کنبہ ہی سارا اُجڑ گیا (۴۶) مٹی میں کیسے کیسے ملے میرے مہ لقا
رو رو کے ان کی یاد نہ کیونکر مناؤں میں
فرشِ عزا جہاں پہ بچھے کیوں نہ آؤں میں

کرب و بلا ، مناظرِ خوں بار ہائے ہائے تنہا حسینؑ ، لشکرِ اشرار ہائے ہائے
خیمے میں ایک عابدِؑ بیمار ہائے ہائے (۴۷) لُٹتی ردائیں ، زینبِؑ ناچار ہائے ہائے
غم اتنے دیکھے اور نہ پھر روئے سیدہؑ
کیسے لحد میں چین سے اب سوئے سیّدہؑ

انساں نہیں جو تجھ پہ نہ رویا کبھی حسینؑ ہر ایک دل کی بس ہے تمنا یہی حسینؑ
رہتی ہے اب تو آنکھوں میں ہر دم نمی حسینؑ (۴۸) بزمِ عزا میں روتے ہیں سب ماتمی حسینؑ
اشکِ عزا کبھی بھی نہ کم ہونے پائیں گے
پلکوں پہ یہ چراغ سدا جگمگائیں گے

فرشِ عزا سے آج بھی آتی ہے یہ صدا آئی ہیں پُرسہ لینے یہاں بی بی فاطمہؑ
پیٹو سروں کو اور کرو نالہ و بُکا (۴۹) ماتم سے اور نوحے سے ہے رونقِ عزا
روئے گا وہ یہاں پہ اُسی شور وشین سے
اُلفت ہے جس کو جتنی زیادہ حسینؑ سے

آنکھیں ہیں ، آنسوؤں کی روانی ہے یا حسینؑ لب ہیں زباں ہے ، مرثیہ خوانی ہے یا حسینؑ
سینہ ہے اور دردِ نہانی ہے یا حسینؑ (۵۰) ہاتھوں سے تیری یاد دہانی ہے یا حسینؑ
ماتم کی زد پہ حشر تلک ہے یزیدیت
زندہ رہے گی سینہ زنی سے حسینیتؑ

میر انیسؔ

ڈاکٹر جاوید منظرؔ

جب فکر نے انساں کو نئی راہ پہ ڈالا (۱) جب روح نے احساس کے دامن کو سنبھالا
جب وقت نے دنیا کو عجب رُخ سے اُجالا جب غم کے تلاطم میں گھِرے تھے شہؑ والا
اُس وقت جو ہر قلب میں رہتا تھا وہ تو تھا
ایسے میں کوئی شعر جو کہتا تھا وہ تو تھا

ایسا تو کوئی تھا نہ کوئی ہوگا سخنور (۲) لفظوں کے پرے سب نے ہی دیکھے ترے در پر
ہاتھوں کو اُٹھا کر کبھی اشکوں کو بہا کر تو شعر سناتا تھا کہ دِکھلاتا تھا منظر
اشعار سے تصویر جو کربل کی بنائی
ہم کو غمِ شبیرؑ کی دنیا نظر آئی

تھی نوکِ قلم ، یا کوئی برچھی کی اَنی تھی (۳) تحریر غمِ سبطِ پیمبرؐ سے سجی تھی
قرطاس پہ اشعار کی وہ دھوم مچی تھی گویا کہ یہیں کرب و بلا عام ہوئی تھی
ایسے میں سدا ہم نے تو دیکھا یہی منظر
تو لمحوں پہ رکھ دیتا تھا اشکوں کو سجا کر

ہم اُس کو بتائیں گے جو پوچھے کوئی ہم سے (۴) کیا کیا نئے الفاظ ملے تیرے قلم سے
تو لفظ پروتا رہا شبیرؑ کے غم سے اردو کی فصاحت بھی ملی تیرے ہی دم سے
شعروں میں جو سمٹی تری پل پل کی کمائی
کربلا ہمیں ہر غم سے فزوں تر نظر آئی

تو نے تو عجب طور سے ہر لفظ لکھا ہے (۵) متروک کوئی ان میں نہ دیکھا نہ سنا ہے
مجلس میں ہر اک لفظ پہ یوں آہ و بُکا ہے کیا کوثر و تسنیم سے ہر شعر دھلا ہے
ہم جس پہ کریں ناز وہ اک تیرا ہی غم ہے
تو وہ جو براہیمؑ کی اُمّت کا قلم ہے

فطرت نے عجب رنگ میں ڈھالا تجھے یکسر (۶) شبیرؑ کا غم دے کے اُجالا ترا پیکر
لفظوں کا کہیں ایسا نہ دیکھا کبھی لشکر اس بات پہ ہم فخر کریں تجھ پہ نہ کیونکر
مظلوم کا غم سارے زمانے کو دکھایا
تو نے ہی ہمیں سبطِ پیمبرؐ سے ملایا

اے فکرِ انیسؔ ہم پہ بھی وا کر درِ مدحت (۷) شعروں سے ترے سب کو ملی نفس کی حرمت
شبیرؑ کا غم عام ہوا تیری بدولت ہوتی ہے اسی طرح سے مولاؑ کی زیارت
جو علم کے در سے کسی صورت بھی قریں ہے
ہر دور میں وہ فکر کی دنیا کا امیں ہے

❁❁❁❁

امام علی نقی علیہ السلام

ڈاکٹر ناشرؔ نقوی

اے ہادیٔ دیں ، فخرِ امامت مرے مولا (۱) اے صاحبِ توقیر و طہارت مرے مولا
اے ابرِ کرم جود و سخاوت مرے مولا اے رحمتِ پیغمبرِ عصمت مرے مولا
آثارِ نبوت تمہیں حاصل ہیں تقیؑ سے
تم عالم بالغیب ہوئے نامِ نقیؑ سے

ایک ربطِ امامت سے بنائے گئے اعلا (۲) پھیلایا لڑکپن ہی میں ولیوں کا اجالا
چھ سال کی ہی عمر میں منصب کو سنبھالا اس طرح ، زمانے کے ہوئے تم شہِؑ والا
پاکیزگیٔ نفس میں قدوس رہے ہو
تم تیز ہواؤں میں بھی فانوس رہے ہوں

مولا ہو ، مددگار ہو ، شاہا ہو ، ولی ہو (۳) عصمت کے گلستان کی گُل رنگ کلی ہو
پیشانیٔ اسلام کے تم ، حرفِ جلی ہو خود اپنے زمانے کے محمدؐ ہو ، علیؑ ہو
اسلاف کے اوصاف کی روداد رہے ہو
وہ جود و سخاوت ہے کہ جواد رہے ہو

کم عمری بزرگی کی علامت ہے تمہاری (۴) کس شان کی توقیر و صداقت ہے تمہاری
چونتیس برس تک کی امامت ہے تمہاری ہر معتصمِ جبر پہ ہیبت ہے تمہاری
گھبرائے اسیری سے ، تشدّد سے نہ غم سے
ہنستے ہوئے گزرے ہو ہر اک راہِ ستم سے

اک طرزِ امامت کا جو ہر گام نگہباں (۵) اک ولولۂ صبر کہ جو ، نورِ بدخشاںؑ
اک ایسا توکل ، متوکل بھی پریشاں اک عزم کہ شاہی کا تکبر بھی ہراساں
چھوڑا تھا مدینہ ، تو بڑا صبر کیا تھا
شبیرؑ کی ہجرت سے نیا جوش لیا تھا

تم اپنے مصائب سے فضائل کے ہو شہکار (۶) تشبیہ میں تنبیہ میں تفسیر کے معیار میں
خطبات و کلامی میں رہے صاحبِ گفتار خود علمِ لدُنی نے پکارا تمہیں ہر بار
اعلانِ صداقت ہو ، دمِ حیِ و صمد ہو
تم نور ہو اوّل کا ، تو آخر کے بھی جد ہو

ہادیٔ دہم سامرا والے ، شہِؑ حجّت (۷) میں نام نقیؑ لوں تو زباں کی ہو طہارت
ہے اسمِ گرامی سے تمہارے مری نسبت مدحت کا سلیقہ مجھے بخشا مری قسمت
کیا حقّ ثنا ہوگا اِس آشفتہ بیاں سے
الفاظ نکلتے نہیں ناشرؔ کی زباں سے

مرثیۂ دبیرؔ میں سراپا نگاری

محمد علی ظاہر

جب ہم کسی کو دیکھتے ہیں تو اس کی شکل ہمارے ذہن میں دو سطح پر کام کرتی ہے اول تو اس کی مخصوص شناخت ہمارے ذہن میں قائم ہوتی ہے دوسرا ہماری حسِ جمالیات اس کے خوبصورت یا بدصورت ہونے کے متعلق ایک تاثر قائم کرتی ہے۔خوبصورتی یا بدصورتی کا یہ تاثر بذات خود ہماری یادداشت سے جڑا ہوا ہے۔بعض ماہرین بشریات نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تصورِحسن مکمل طور پر یادداشت سے ملحق ہے۔ ایک بچہ اپنے تولد سے بلوغ تک کی مدت میں اپنے اردگرد جیسی شکلیں دیکھتا ہے وہ خدوخال اس کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہو جاتے ہیں شعور کی حد کو پہنچنے کے بعد جب وہ کسی ایسی صورت کو دیکھتا ہے جس کے نقوش اس کے ذہن میں پہلے سے محفوظ شدہ نقوش سے مطابقت رکھتے ہوں یا ان سے ملتے جلتے ہوں تو وہ اسے حسین معلوم پڑتی ہے۔اس حوالے سے بعض افریقن قبائل سے استدلال کیا گیا ہے کہ جب نیوگینی کے سیاہ فام قبائیلیوں کو ایک انگریز عورت دکھائی گئی تو انھوں نے اسے بدصورت قرار دیا جبکہ سیاہ فام عورت کو خوبصورت قرار دیا۔ ماہرین اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ چونکہ یہ قبائل ایک مدت سے انھی علاقوں اور انھی افراد تک محدود ہیں انھوں نے نسل در نسل صرف سیاہ فام لوگ ہی دیکھے لہٰذا ان کی یادداشت سے سیاہ نقوش ہی مطابقت پیدا کر سکے اور حسین قرار پا سکے۔

یہ تھیوری سائنسی طور پہ کتنی صحیح یا غلط ہے میں نہیں جانتا البتہ اگر اسے ادب پر اپلائی کیا جائے تو مضمون آفرینی سے پیدا ہونے والے لطف کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔شاعری کی بھی ایک یادداشت ہے جس میں روایتی مضامین کے خدوخال محفوظ ہیں مثلاً زلف کا طویل ہونا، کمر کا باریک ہونا، دہن کا کم نما ہونا وغیرہ۔لہٰذا جب کوئی کلاسیک شاعر چشمِ تخیل سے ایسا سراپا دیکھتا ہے جو اس شعری لاشعور میں محفوظ شدہ خدوخال سے مطابقت رکھتے ہوئے ایک نیا پن لیے ہو تو ذوقِ شعری اسے حسین قرار دیتا ہے۔مثلاً ''زلف کی طوالت چونکہ شعری یادداشت میں محفوظ ہے لہٰذا ہر کلاسیک شاعر زلف کو طویل ہی باندھے گا۔جدید دور میں بوائے کٹ کتنا ہی مقبول ہو جائے مگر شاعری میں زلف ہمیشہ طویل ہی بھلی معلوم ہو گی کیونکہ یہ شاعری کی یادداشت میں محفوظ ان نقوش میں سے ہے جنھیں شاعر کا ضمیر نسل در نسل بچپن سے بلوغ تک محسوس کرتا آیا ہے۔البتہ طوالت کا رنگ اس کی طبع کی کرشمہ سازی پر موقوف ہے۔

طوالت زلف کی طرح معروف مضامین میں ایک مضمون محبوب کے دہنِ تنگ سے متعلق ہے۔دہن کو کلاسیکی شاعری میں جس قدر تنگ دکھایا جائے گا اتنا شعری حسن بڑھے گا، بالفاظ دیگر منہ کا چھوٹا ہونا کلاسیکی شعری تصویرِ حسن میں بڑا مضمون ہے۔اسی سے ''غنچہ وہاں'' کی اصطلاح ہے کہ شباہت کے اعتبار سے غنچہ کا منہ نہایت کم ہوتا ہے۔یہ تنگ دہانی اساتذہ نے غنچہ دہانی سے شروع کی پھر تنگی دہن کو غنچہ ناشگفتہ دکھایا حتی کہ سرے سے دہن کے وجود کا ہی انکار کر دیا گویا دہن اتنا تنگ ہے کہ کسی نے پایا ہی نہیں۔

دہن تنگ کے ترے مشتاق آرزوئے محال رکھتے ہیں (میرؔ)

کہاں غنچہ کہاں اس کا دہن تنگ بڑھائی شاعروں نے بات تھوڑی (امیر مینائیؔ)

نام ہی نام سنو ان کا وہ آویں نہ نظر ہے یہی بس دہن تنگ و کمر کی خوبی (حکیم آغا جان عیشؔ)

بعض اساتذہ نے دہن کو سیدھا ملک عدم سے ہی تشبیہ دے ڈالی کہ عدم کس نے دیکھا ہے جومحبوب کا دہن پا جائے۔اسی ذیل میں قدرے مختلف

زاویے سے میر تقی میرؔ کا ایک شعر ہے:

دہن غنچہ و ناشگفتہ سے کم
سخن رہر وراہ ملک عدم

یہی مضمون آفرینی کی روایت مرزا دبیرؔ نے بھی سراپا کے جزو میں قائم رکھی اور فن کے معجزے دکھائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرزا دبیرؔ کی سراپا نگاری دراصل مضمون آفرینی ہی ہے۔لہٰذا ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے سراپا کے روایتی مضامین کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ یہ مطابقت پیدا کرتے ہوئے کس احتیاط کے پابند ہیں۔غزل کے شعرا کے لیے ایک چھوٹ یہ ہے کہ ان کا محبوب مجازی ہے لہٰذا مضمون باندھتے ہوئے کسی احتیاط کا دامن نہیں تھامنا پڑتا۔مرثیہ کا معاملہ اسی وجہ سے مثنوی اور غزل سے اختلاط رکھنے کے باوجود اپنی الگ حدود اربعہ تشکیل دیتا ہے۔

دہن تنگ کی مثالوں میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دہن اتنا موہوم ہے گویا عدم ہے مگر دبیرؔ مرثیہ کے پل صراط سے گزر رہے ہیں۔اب اگر دہن کو عدم کہتے ہیں تو بھی نامناسب اور مجبوری یہ ہے کہ دہن کو دکھانا بھی کم نما ہے۔ایک جانب عقیدت پہ ضرب پڑتی ہے تو دوسری طرف مضمون آفرینی ہاتھ سے جاتی محسوس ہوتی ہے۔لیکن یہ ذہین ومشاق شاعر اپنی طبع رسا سے ایک ایسی راہ تراشتا ہے جو بیک وقت عقیدت اور مضمون دونوں کو نہ صرف برقرار رکھتی ہے بلکہ دونوں کے ارتقا کا سبب بنتی ہے۔حضرت عباسؑ کے دہن کی توصیف میں تنگ دہانی کا مضمون یوں باندھتے ہیں:

مدرج دہن پاک سے ہے بزم معطر لبریز زباں غنچہ ، دل ہے مرا ایکسر
اک اور سنورازِ دہاں ہم سے مکرّر مہدیؑ کے بھی اعداد دہن سے ہیں برابر

ظاہر یہ دہن کرتا ہے اسرارِ نہاں کو دیتا ہے خبر غیبت مہدیؑ کی جہاں کو جو دہن تنگ ملک عدم کے مضمون پہ نازاں تھا غیبت مہدی کی نسبت سے کیسا نیا ہو گیا،مگر ذرا رکیے!اگر یہی مضمون غیبت مہدی کا غزل کے محبوب کے دہان تنگ کی تعریف میں ہوتا تو کیا لطف رہتا؟ ہرگز نہیں! کیونکہ غزل کے محبوب کا تعلق فقط جمالیات سے ہے روحانیات وعرفانیات سے نہیں (محبوب حقیقی سے قطع نظر)۔ پتا چلا کہ یہاں غیبت کے مضمون سے زیادہ ذات ممدوح کا عمل دخل ہے۔ممدوح چونکہ صاحب تقدیس ہے لہٰذا اس کے شایان شان معنی آفرینی کے لیے مذہبی تلمیح کا استعمال کیا۔اس سے ۲ فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ مضمون آفرینی کو وسعت ملی،دوسرا یہ کہ ممدوح کا تقدس قائم رہا۔ایک تیسرا فائدہ ضمناً یہ بھی ہوا کہ جو مضمون محض خیال کی بنیاد پہ استوار تھا،مذہبی تلمیح آنے سے محض خیالی نہ رہا بلکہ ایک طے شدہ حقیقت کے تابع ہو گیا لہٰذا اسے تسلیم کرنا

قاری کے لیے آسان ہو گیا۔

فی الحال ہم ان باریکیوں پر گفتگو نہیں کر رہے کہ بزم کے مہکنے کا سبب خوشبوئے دہن نہیں فقط دہن کی مدح ہے۔ نہ ہم ان لفظی رعایتوں کی جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ بظاہر غنچہ دہن کی ترکیب استعمال نہیں کی مگر الگ الگ مصرعوں میں غنچہ اور دہن دونوں رکھ دیے۔ ہم ابھی اس لطف کو بھی موضوع نہیں بنانا چاہتے جو سننے اور دہن کی تعلق میں ہے۔ علم ابجد کی عالمانہ نکتہ دانیوں کی داد بھی ہم ابھی نہیں دینا چاہتے۔ نہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پانچویں مصرعے میں ظاہر اور نہاں کا لفظ فقط صنعت تضاد نہیں بلکہ امام مہدی کے نہاں ہونے اور ظہور کی رعایت بھی ہے۔ ہم ان عقیدتی مناسبتوں کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتے جو حضرت عباس اور امام مہدی کے تعلق میں ہیں کہ حضرت عباس علیہ السلام کو جنگ لڑنے کی اجازت نہ تھی اور آپ کے دل میں یہ حسرت رہ گئی چناچہ آپ نے صبر فرمایا، جبکہ امام مہدیؑ منتقم آل محمدؐ ہیں پردہ غیبت میں آپ جناب بھی قائم بالصبر ہیں جو ظہور فرمائیں گے تو باطل سے جنگ لڑیں گے۔ اور یہ کہ حضرت عباسؑ کی حسرت جنگ خروج امام مہدیؑ سے پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔ اور یہ کہ حضرت عباسؑ بغیر ہاتھ کے عطا کرتے ہیں اور امام مہدیؑ بفیض غیبت نظر نہ آنے والے ہاتھ سے عطا کرتے ہیں۔ ان نسبتوں سے ملاحظہ کیجے تو یقیناً دہان عباسؑ کی توصیف میں ایسا ہی عرش قامت مضمون چنا تھا جسے دبیر نے مرقع فن و عرفاں بنا دیا۔ لیکن ہم ان باریکیوں سے نکل کر فی الحال یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ دبیرؔ کے ہاں سراپا نگاری کے اسالیب کس کس نوعیت کے ہیں۔

سراپا نگاری لکھنو کی شاعری کا نمایاں وصف ہے اور یہ مرثیے میں غزل سے داخل ہوئی۔ لکھنو میں سراپا کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ محسن علی محسن لکھنوی نے اپنے تذکرہ سراپا سخن میں صرف سراپا سے متعلق اشعار کی ہی مثالیں دیں۔ سراپا کو جزو مرثیہ قرار دینا مرزا دبیرؔ کے استاد مظفر علی ضمیرؔ کا کارنامہ ہے۔ ان کا معروف بند ہے:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکلِ نبیؐ کے ۔۔۔ سن بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سے تھے نہ کسی کے ۔۔۔ یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

مرزا دبیرؔ نے سراپا نگاری کو ایک نئے اوج سے روشناس کرایا۔ حضرت حرؑ کا سراپا سب سے پہلے مرزا دبیرؔ نے کہا اور تعلّی میں اعلان بھی کیا، اس مرثیہ کا مطلع ہے ''جب سرنگوں ہوا علم کہکشانِ شب'' فرماتے ہیں:

اب ہے یہاں اشارۂ تائیدِ کبریا ۔۔۔ شکلِ ہراولِ شہؑ دیں کھینچ کر دکھا
قربان اس اشارے کے اس لطف پر فدا ۔۔۔ اب تک کسی نے حرؑ کا سراپا نہیں لکھا
گنجینہ فیض سے ہے خدا کا بھرا ہوا
مضمون میرے حصّے کا یہ تھا بچا ہوا

لکھنؤ کی غزل میں جو سراپا لکھا جاتا رہا اس کے دو بنیادی محرک تھے۔ ایک عریانی اور جسمانی لذت کا حصول اور دوسرا ناسخؔ کے زیر اثر دور پار کے مضامین لانے کی کاوش۔ مرثیے میں سراپا آیا تو اس کا تزکیہ ہو گیا۔ اب اس کا رخ لطافت اور روحانی لذت کی جانب ہو گیا۔ البتہ

ناسخؔ کے زیرِاثر نازک خیالی کو یہاں مزید فروغ ملا۔ مرزا دبیرؔ پہ اپنے استاد ضمیرؔ کا اثر اوران کے استاد پہ ناسخؔ کا اثر باآسانی ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ ضمیرؔ کے ہاں سراپا کے انوکھے مضامین تو ملتے ہیں تاہم ان میں ایک آنچ کمی کا سا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ضمیر کی ایک بیت دیکھیے:

پیشانی تو آئینۂ لبریز صفا ہے
ابرو ہے کہ خود قبلہ ہے اور قبلہ نما ہے

ضمیرؔ ابرو کو قبلہ اور قبلہ نما کہہ کے رک جاتے ہیں مگر دبیرؔ اس مضمون کو کعبے سے بھی ایک منزل آگے لے جاتے ہیں:

دیکھا جو مہِ نو نے اس ابرو کے شرف کو
کعبے کی طرف پشت کی ، رخ اس کی طرف کو

دبیرؔ نہ صرف اپنی جدت طرازطبیعت سے نئے، انوکھے اور حیران کن مضامین قلمبند کرتے ہیں بلکہ ان میں تخیل کی شدت کو ایسا مضبوط کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا پہلے تھوڑی وقت سے دو چار ہوتا ہے، پھر حیرت سے سرشار ہوتا ہے اور ذہن میں اس مضمون کی تصویر جب مکمل کھینچ جاتی ہے تو اپنے وجود میں ایک ترفع محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ عمل کسی انکشاف کی طرح ہوتا ہے۔ مثلاً یہ بند دیکھیے۔

بینی کو کہوں شمع تو لو اس کی کہاں ہے   پر نور بھنووں پر مجھے شعلے کا گماں ہے
دو شعلے اور اک شمع یہ حیرت کا مکاں ہے   ہاں زلفوں کے کوچے سے ہوا تند رواں ہے
سمجھو نہ بھنوئیں بس کہ ہوا کا جو گزر ہے
یہ شمع کی لو گاہ ادھر گاہ ادھر ہے

مراثیِ، دبیرؔ کے مطالعے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہاں سراپا نگاری کے ایک سے زائد اسلوب ہیں۔ گو ان تمام اسالیب میں ایک زیریں لہر خیال آفرینی کی کارفرما رہتی ہے تاہم اثر پذیری کے لحاظ سے ہر انداز کی انفرادیت براہ راست محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان تمام اسالیب میں کوئی نہ کوئی صنعت لازمی پائی جاتی ہے۔ ایک سرسری جائزے میں ان کے ہاں سرپا نگاری کے چیدہ چیدہ اسالیب یہ ہیں:

نازک خیالی

گیسوئے رسا روئے کتابی کے قریں ہے   قرآن کا حافظ پر جبریلؑ امیں ہے

تمثیلی واستعاراتی پیرایہ

ہے ریش کے ہالے میں عیاں روئے دل افروز   آغوشِ شبِ قدر میں ہے یوسفِ نوروز
ماتھے کا عرق پاک کیا انگلی سے بارے   سورج سے کیے دور مہِ نو نے ستارے

تقابل وموازنہ

موتی قسم ان دانتوں کی کھاتے ہیں صرف میں   لعل ایسے بدخشاں میں نہ دُر ایسے نجف میں

مابعد الطبیعاتی تلازمے

سرمے کی جو خواہش مہ وخورشید نے پائی   داغ اس کا بنا سرمہ، کرن اس کی سلائی

پیچیدہ خیالی

حضرتِ حرؑ کے کندھوں پر گیسوؤں کے متعلق فرماتے ہیں

گوشانہ بنا صورتِ انگشت سراپا — پر عقدہء تعریف دو گیسونہ کیا
وا ہیں گوش دوات اور قلمِ موہیں مہیا — مالک ہیں سپیدی و سیاہی کے کمی کیا

لو گیسوؤں کے شبہ میں ہم آج تلک ہیں — یہ کاندھوں پہ اعمال کے کاتب دو ملک ہیں

عرفانیاتی اسلوب

قرآں ورق ورق سے سپر ہے حسینؑ کی — چشمِ نبیؐ زرہ ہے شہِؑ مشرقین کی

اجزائے سراپا کے فضائل

دم قالب بے جاں میں جو دم کرتے تھے عیسیٰؑ — ان ہونٹوں کے اعجاز کا دم بھرتے تھے عیسیٰؑ

غم انگیزی

ہر جزو بدن پرزے ہے ہر عضو جدا ہے — دفتر میں شہادت کے مگر چہرہ لکھا ہے

سراپا کا بیان عموم فضائل کے لیے ہوتا ہے لیکن دبیرؔ نے سراپا سے مصائب کے بھی ایسے ایسے زاویے نکالے ہیں کہ ایک مصرع پر اگر بے ساختہ واہ نکلتی ہے تو دوسرا مصرع آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اگر فن پہ نگاہ پڑ جائے تو دونوں مصرعوں میں صنعتوں کا اہتمام دیکھ کر دل پھر سے شاعر کی خلاقیت کو سراہنا چاہتا ہے۔ امام حسینؑ کے سراپا سے یہ مثال دیکھیے:

لب قفل درِ مخزنِ اعجاز و کرامت — پر کھولے گئے چوب سے وہ بعد شہادت
گیسو تھے کہ شیرازۂ اجزائے شریعت — پر ان کی پریشانی تھی دلجمعیٔ امت
تھی ان کو غرض عقدہ کشائی جہاں سے
موجود تھے بندھنے کے لیے چوبِ سناں سے

لبوں کا قفل درِ مخزنِ اعجاز وکرامت ہونا اور اس قفل کا بعدِ شہادت چوب سے کھولا جانا، گیسوؤں کا جہاں کا عقدہ کشا ہونا اور خود چوب سے بندھنا، یہ صرف لفظی تضاد نہیں بلکہ کیفیتی تضاد ہے، سمجھ نہیں آتی یہاں فن کی داد دی جائے یا مصائب کے سوز کو محسوس کیا جائے۔ جیسے مرزا صاحب فضائل میں سے مصائب کے پہلو نکالنے میں طاق ہیں اسی طرح مصائب کے منظر میں فضائل کی تصویر کشی بھی ان کا خاص رنگ ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد امامِ سجادؑ اور مستوراتِ اہلبیتؑ کی اسیر گی اور بے ردائی مقتل کی مصیبتوں سے بھی بڑی مصیبت سمجھی جاتی ہے، یہ ایسا مقام ہے جہاں دل غم کے سوا کوئی اور احساس چاہتا ہی نہیں۔ اور اس حوالے سے بھر پور بینیہ مراثی لکھے گئے ہیں لیکن مرزا دبیرؔ اپنے ایک مرثیے ''جب عابدِؑ مریض کو داغِ پدر ملا میں اسیریٔ اہلبیت کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور یہاں بعض مصرعوں میں سراپا نگاری ایک نیا باب وا کرتی نظر آتی ہے۔ یہ دو بند ذرا مسلسل دیکھیے:

کیوں کر کہوں کہ آلِ پیمبرؐ ہیں بے ردا　　سر کھلنے سے چھپا ہوا رتبہ مگر کھلا
احسانِ چادر ان کے سروں سے نہ اٹھ سکا　　سر پر ردا نہیں ہے تو ہے سایۂ خدا
کچھ رب سے دور یہ نہیں دور ان سے رب نہیں
چادر کا پردہ بیچ میں تھا وہ بھی اب نہیں
رُخ نے نقابِ گیسوئے مشکیں جو پائی ہے　　قبلے کی سمت کیا ہی گھٹا غم کی چھائی ہے
یا ان کے پردے کو یہ شبِ قدر آئی ہے　　کعبے نے پوشش اپنی حرم کو اڑھائی ہے
گیسو کشادہ مریمؑ و حوّاؑ جلو میں ہیں
یہ اک طرف خدیجہؑ و زہرؑا جلو میں ہیں

امامِ سجادؑ کی اسیری کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

کرتا بدن میں ہے نہ گلے میں عزا کی شال　　پر طوق ہے گلے میں گریبان کی مثال
موزوں ہے کیا ہی مصرعِ زنجیر حسبِ حال　　مضموں ہے جس کا پائے امامِ ملک خصال
دو بیڑیاں جو پہنیں جزا اس کی کیا ہوئی
دونوں جہاں کے رنج سے اُمّت رہا ہوئی

درج بالا اسالیب محض نظری ہیں اور فقط نمونے کے لیے ہیں۔ان پہ وقت سے کام کیا جانا چاہیے۔حقیقتِ حال یہ ہے کہ دبیؔر کے ہاں سراپا نگاری بعض اوقات ایسے انداز میں آتی ہے کہ اس کا اسلوب محسوس تو کیا جا سکتا ہے البتہ طے نہیں ہو پاتا کہ اسے کس کیٹیگری میں رکھیں۔ہاں ایک بات بیشتر مراثیِ دبیؔر میں محسوس ہوتی ہے کہ دبیؔر کا سراپا محاکاتی نہیں۔مثلاً تعشقؔ کا ایک مصرع ہے:

شملہ چھٹا ہوا ہے گریباں کھلا ہوا

اس مصرعے سے ہو بہو ایک تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔دبیؔر کا مقصد سراپا نگاری سے ممدوح کی محاکات نگاری ہرگز نہیں بلکہ وہ تو سراپا سے ایک الگ ہی کائنات تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ایسا بھی نہیں کہ وہ محاکات کا بالکل بھی استعمال نہیں کرتے تاہم ان کا غالب رنگ یہ نہیں۔وہ سراپا ''دکھانا نہیں چاہتے بلکہ سراپا'' منوانا چاہتے ہیں۔ان کا سراپا اپنی الگ جمالیات رکھتا ہے اور وہ سراپا نگاری سے بنیادی طور پر قصیدے کا کام لینا چاہتے ہیں۔مثلاً یہ بند دیکھیے:

چہرہ چمنِ قدرتِ خلّاقِ دو عالم　　خورشید ہے اس باغ کا اک قطرۂ شبنم
عیسیٰؑ ہے سخن، ہونٹ طہارت میں ہیں مریمؑ　　اور روحِ مسیحالبِ جاں بخش کا اک دم
ہر صنعتِ حق اک رخِ روشن سے عیاں ہے
جاں قالبِ آئینہ میں اس رُو سے رواں ہے

ان کی سراپا نگاری فقط ممدوح کی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ مقابل آنے والے حریف کا سراپا بھی مکمل اہتمام کے ساتھ لکھتے ہیں اور مضمون آفرینی، پیچیدہ خیالی کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔جیسے ممدوح کے سراپا سے وہ قصیدے کا کام لیتے ہیں یہاں دشمن

کے سراپا سے وہ ہجو کا کام لیتے ہیں مگر یہ ہجو خلاقیت اور جو ہرِ سخن سے بھر پور ہوتی ہے۔ایک مرثیے ان کا موضوع کے اعتبار سے بہت منفرد ہے

جب قرب ہوگا آمدِ روزِ نشور کا

اس میں انھوں نے دجال کا خروج اور امام مہدیؑ کا ظہور فرمانا لکھا ہے۔دجال اور امام کے لشکر کی جنگ بھی لکھی ہے اور دونوں کا سراپا بھی الگ الگ لکھا ہے۔سراپا میں ایک عام مضمون بینی یعنی ناک کو الف سے، ابرو کو نون سے زلف کو لام سے اور چشم کو عین سے تعبیر کرنا ہے۔ ممدوح کے سراپوں میں حروفِ تہجی سے کام لیتے ہیں تو فرماتے ہیں:

گیسو دلیلِ شرع کے دولام لا کلام   رخ پر ہوا سے آ گئی گر زلفِ مشک فام
اس میں نمود یوں الف بینیِ امامؑ   جس طرح لام میں ہے الف اور الف میں لام

یعنی زلف کا لام اگر ہوا سے اڑ کے رخ پہ آ جائے تو اس میں بینی کا الف ایسا ہی دکھائی دے گا جیسے حرف لام میں الف اور الف میں لام آتا ہے۔ یہ پیچیدہ خیالی جیسے ممدوح کے سراپا میں ہے حریف کا نقشہ کھینچتے ہوئے بھی اسی طرح اپنے جوہر دکھاتی ہے۔مضامین وہی ہیں مگر ان کا زاویہ بدل گیا ہے۔دجال کا سراپا دکھاتے ہیں:

بے شبہ لامِ ظلم وہ گیسوئے پیچ دار   عصیاں کا نون ابروئے دجالِ نابکار
اس لام اور نون میں یوں چشم آشکار   جوں درمیان لعن کی ہے عین بر قرار

یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کلی طور پہ دشمن کے سراپے کو ہجو کے لیے ہی کہتے ہیں بلکہ ایک انصاف پسند تخلیق کار کی طرح جہاں کسی نامی گرامی پہلوان سے مقابلہ دکھانا ہو اس کی ہیبت کا نقشہ بھی مکمل ایمانداری سے کھینچتے ہیں۔ذرا یہ بیت دیکھیے۔

لشکر شام سے ایک پہلوان نکل کے لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔اس نے اپنے جسم کو اسلحے سے لیس کر رکھا ہے۔سر پہ خود اور چہرے پہ جھلم سجا رکھا ہے۔جھلم خود کا وہ حصہ ہوتا ہے جو ایک نقاب کی طرح چہرے پہ پہنا جاتا ہے تاکہ دورانِ جنگ چہرہ زخم کھانے سے بچا رہے۔اب یہ بیت دیکھیے:

جز عیب کفر محض ہنر وہ دلیر تھا
منہ پر جھلم پڑی تھی کہ برقعے میں شیر تھا

اسی طرح یہ بیت بھی دیکھیے۔

چار آئینہ سینے کے چاروں جانب فولادی چادریں ہوتی ہیں جو سپاہی حفاظت کے لیے پہنتے ہیں اور مرثیوں میں عموماً ڈھال کو سیاہ پھول سے یا سیاہ بادل سے تشبیہ دی جاتی ہے:

چار آئینے سے شہر بدن تھا حصار میں
اندھیر اس کی ڈھال سے تھا روزگار میں

یہ کریڈٹ بھی مرزا دبیر کو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں نہ صرف نادر مضامین سراپا پیش کیے بلکہ منفرد شخصیات کے سراپے لکھے جن میں حضرت حرؑ، حضرت حبیب ابنِ مظاہرؑ، حضرت عبداللہ بن عفیف کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن عفیف کربلا میں موجود

نہیں تھے دربار میں اہلبیتؑ کے پیش ہونے کے واقعے پر موجود تھے۔آپ بزرگ صحابی رسول تھے اور نابینا ہوچکے تھے۔دلچسپ امر یہ ہے کہ آنکھوں پر لکھا تو میدانِ سراپا میں کھل کھیلنے کے مترادف ہے اب کوئی نابینا ہے تو اس کی آنکھوں پہ کیا لکھا جائے۔مگر یہ ذہین شاعر یہاں بھی اپنی جولانی،طبع سے جواز پیدا کر لیتا ہے۔چونکہ ابروؤں کی شباہت ہلال سے ہے اور ابروں کے طاق میں آنکھیں ہیں مگر آنکھوں کا چراغ گل ہے،فرماتے ہیں:

محاورے کی رعایت اسے ایک اور جواز دیکھیے:

مردم عبث ہیں آنکھوں کے یاں اشتیاق میں　　　ہوتے نہیں چراغ مہِ نو کے طاق میں

خیبر شکن کے شیعوں میں یہ صف شکن ہوئے　　　خود شیر تھے سو چشم کے آہو ہرن ہوئے

درج بالا تمام گفتگو کی روشنی میں ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ مرزا دبیرؔ کی سراپا نگاری اپنا الگ مزاج رکھتی ہے اور اس پر کار کا مرکزی نکتہ ان کی جودت و ذہانت ہے جو مشکل سے مشکل امر میں بھی نہایت چابک دستی سے مظاہرہ،فن کرتی ہوئی اپنے قارئین کو حیران و سرشار چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ان کا اصل مزاج مضمون آفرینی،نازک خیالی،پیچیدہ تخیل،نئے اور انوکھے مضامین کی تلاش سے عبارت ہے۔وہ سراپا کو محض تصویر کھینچ دینے کا عمل نہیں سمجھتے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ اس تصویر کو کیسا ہونا چاہیے!وہ سراپا کے مضامین میں صنائع بدائع کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور اس میں صنعت تضاد اور حسن تعلیل سے اکثر کام لیتے ہیں۔ان کا پیرایہ تمثیلی ہوتا ہے اور پیچیدہ استعارات سے ایک منظر تشکیل دیتے ہیں۔ان کے مضامین زور بیان سے معمور ہیں۔فی زمانہ ذوق شعری بدل چکا ہے۔آج پیچیدہ خیالی کو اتنا پسند نہیں کیا جاتا،مضمون آفرینی یکسر ختم ہو چکی ہے،دہن و زلف کے موضوعات کو کلیشے مانا جاتا ہے،صنائع بدائع کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مرزا دبیرؔ کا کام ایسا ہے کہ آج بھی ہم اس حلقے میں ان پر مضمون پڑھ رہے ہیں۔ہوسکتا ہے کوئی سوچے کہ آج کے عہد میں مرزا دبیرؔ کی سراپا نگاری پڑھنے سے ہمیں کیا ملے گا تو اس کے جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ جب تک انسان میں جمالیات کا احساس باقی ہے تب تک سراپا کی اہمیت مسلم ہے۔

❁❁❁❁❁

سلام

شاہدہ حسن

کون و مکاں کا فخر ہے ، سجدۂ سر حُسینؑ کا
جذبۂ عبدیت ذرا دیکھ اثر حُسینؑ کا

نسلِ بُریدہ رہ گئی ، شاخِ عداوتِ یزید
رقصِ حیات بن گیا ، ہر گُلِ تر حُسین کا

خوشبوئے خونِ ہاشمی ، اب بھی مُشامِ جاں میں ہے
ہوتا ہے آب و باد سے اب بھی گزر حسینؑ کا

دیکھ کے فصلِ کربلا ، کیسے نہال ہیں رسولؐ
کتنے ثمر سے لد گیا ، ایک شجر حُسین کا

جتنے چراغ تھے وہاں ، نورِ ازل سے ضو فشاں
نقش تھے سب خدائی کے ، دستِ ہنر حُسین کا

اکبرؑ شعلہ رُو کو تھا ، حکم اذانِ آخری
قافلۂ شباب کو اذنِ سفر حسینؑ کا

پھیر کے منہ کو جا چکے ، اسپ بھی اور سوار بھی
تکتی رہے گی راستہ ، دجلۂ تر حُسینؑ کا

شامِ سیہ نے چھین لی بڑھ کے ردائے بیکسی
دیکھ کے زلفِ خم بہ خم ،جُھک گیا سر حُسینؑ کا

محوِ خرام کون ہے ، راکھ کے ایک ڈھیر پر؟
وضع تو ہے بتولؑ کی ، قلب و جگر حُسینؑ کا

مانگ رہی ہیں سیّدہؑ ، سب کی نجات کی دعا
دستِ دعا میں تھام کر خوں بھرا سر حُسینؑ کا

سلام

قیصر عباس قیصرؔ

سب شور کررہے ہیں یہ کوفے میں کیا ہوا
سرورؑ کا ساتھ چھوڑا نتیجے میں کیا ہوا

سبطِ نبیﷺ نے کس لیے ترکِ وطن کیا
یہ بھی بیاں کرو کہ مدینے میں کیا ہوا

افتاد کیا پڑی کہ نواسہ رسولﷺ کا
حج کو بدل رہا ہے یہ عمرے میں ، کیا ہوا

اے شہرِ امن و حرمتِ کعبہ جواب دے
شبیرؑ بے امان ہے کعبے میں ، کیا ہوا

رسوا ہوا یزید سرِ دشتِ کربلا
دیکھا فریب و ظلم کے سانچے میں کیا ہوا

اہلبیتؑ کے چہرے پہ کالک مَلی گئی
ہم سے سنو کہ آخری سجدے میں کیا ہوا

رکھی گئیں عداوتیں آلِ رسولﷺ سے
دو دن کی زندگی کے تماشے میں کیا ہوا

قیصرؔ ضعیف ہوگئی بیٹی حسینؑ کی
کوئی کہو کہ شام کے رستے میں کیا ہوا

سلام

پروینؔ حیدر

مدح۔سیّدالنساءالعالمین

نوکِ خامہ پہ حرفِ رثا سیّدہؑ
بی الیقیں ہیں عطائے خدا سیّدہؑ

عکسِ آئینۂ مصطفیٰؐ سیّدہؑ
خانۂ مرتضیٰؑ کی ضیاء سیّدہؑ

ہیں تقیہ نقیہ و زہراؑ لقب
عابدہ زاہدہ طاہرہ سیّدہؑ

مالک و زینت و خانۂ پنجتنؑ
زوجۂ شاہِؑ خیبر کُشا سیّدہؑ

ہیں پسر بھی دلیلِ علیٰ ذاتِ رب
اور پدر افضل الانبیاءؐ سیّدہؑ

لا رہے ہیں ملک روٹیاں عرش پر
فقر و فاقہ میں بھی یہ عطا سیّدہؑ

آپ کے ارتقا کی یہ معراج ہے
خود نبوتؐ ہے زیرِ کسا سیّدہؑ

آپ تنویرِ واللیل ہیں
آیتِ شکر و صبر و رضا سیّدہؑ

جانتی ہیں مرا مدعا بِن کہے
مجھ کو دیں گی طلب سے سِوا سیّدہؑ